اردو زبان میں سرورِ عالم ﷺ کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی ﷺ

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

جلد سوم

ادارہ اسلامیات

فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ چہارم)

دیباچہ

طبع اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین﴾

اے باز کن در معانی | بر ما بکلید آسمانی

ہرچہ از تو گماں برہ نہانی | آن کس ہم تواز آن بروئی

شاہ رسل و شفیع مرسل | خورشید ہیکل و نور اوّل

سلطان ممالک رسالت | طغرائے صحیفۂ جلالت (نظامی)

پیش نظر کتاب سیرۃ النبی ﷺ کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے۔ اس کا موضوع "منصب نبوت" ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی و اخلاقی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے بالخصوص آنحضرت ﷺ سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی و اخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں شرح وبسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کی تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو وحی کی زبانی سے جو شریعت کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات۔ خیال تھا کہ عقائد و عبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں مگر جوں جوں مسافر قلم اس دشوار گذار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی۔ ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا۔ دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائض پنجگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہوگا جس میں ہم انشاء اللہ بہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن و معاشرت بالخصوص قوانین نکاح، طلاق، وراثت، حقوق نسواں، غلامی، جہاد، اصول حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے؟ اور آج مغرب نے اس اجمالی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے؟ پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ میں مغرب کا معراج ترقی شریعت اسلام کا پایہ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورۂ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی و اخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی۔ یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں مگر چونکہ

ان میں بکثرت اضافہ اور ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لئے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے قلم پر ہے۔

کوشش کی ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح، استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کو دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے تا کہ اسلام کی تکمیل کی شان نمایاں ہو جائے۔

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلے اکمل تر تعلیمات دینے کے ہیں جو ان کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہ ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾

ان تفصیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے؟ اس لئے اس خوف و خطر سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گذر جانا کس قدر مشکل ہے تاہم میں نے جدوجہد اس کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کروں، چلنے والا تو تھک کر چور ہے اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی؟

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدون و مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں بلکہ اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو دی تھی۔ چنانچہ ان اوراق میں چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو ﴿اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى﴾ میں مذکور ہیں یعنی خدا اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اس کے رسولوں اور آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان، چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قدم صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اس لئے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوند میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنا اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھا۔

﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِىْ﴾ اعراف ۲۲

دیباچہ طبع ثانی

سیرت النبی ﷺ جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول و عقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں تک دے رہا تھا، میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی! لیکن الحمدللہ کہ سوائے تناسخ کی ابحاث وغیرہ ابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیت عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علما اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین و آفرین کی عزت بخشی، اس سے یہی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملاء اعلیٰ کی خوشنودی و رضا مندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جارہی ہے۔ اس میں طبع اول کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کردی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی و شستگی کے لیے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیت نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کردیا ہے تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے تاکہ اس حقیر مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اول چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لئے ۶۸۲ صفحوں کی ایک جلد بن گئی تھی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں رہنا مشکل تھا اس لئے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۴۰۰ سے کتاب دو حصوں میں تقسیم بھی کردی گئی ہے تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کرلے تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۷ رجب ۱۳۵۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

منصب نبوت

کتاب کا موضوع آپ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے واقعات زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ وہ مصلحت وقت کی اتفاقاً پیش آ گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پوری کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔ وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا۔ یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی اور چاہا کہ اس جماعت کو بزور شمشیر مٹا دیں۔ اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی یورش، سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا۔ اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو مسلسل دس سال تک قائم رہ کر رفتہ رفتہ اعجاز نبوت، حسن تدبیر، لطف اخلاق سے ختم ہو کر سر ہونے اور پھر ایک پرامن نظام قائم ہو گیا۔ بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجب منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذات اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے تاہم وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا اصلی براہ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں، جو اسلام کی دعوت واشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے۔ آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہوتے اور وہی آپ ﷺ کی سیرت مبارک کے اصلی وقائع و سوانح ہیں یعنی عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور آخری شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو نور توحید اور سرور محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر جگمگا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، ظلم اور حکومت کا اخلاقی نقشہ سکھانا، گناہوں کے اثر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو حق، رحمت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی، الغرض خاتم المرسلین کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی اصلاح، حسن اخلاق کی تعلیم و تکمیل، قانون الٰہی کا اظہار و عرض اور تہذیب نفوس کی معراج اخیر تھی۔ اور یہ سب کچھ آنجناب کے زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لئے دنیا بظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں مصروف ہو گئے۔ پیش نظر جلد

آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے انہیں واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم:

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے۔ وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سخت محنت اور پُر اثر جد و جہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعر ذلت سے نکال کر ترقی کی بام رفیع تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق، حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں جن کو حکیم کہتے ہیں۔ اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ اسی بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات:

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس[1] میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ اور نقلیات تینوں کوچوں سے واقف ہیں اس لئے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں ان کے ذاتی ذوق و مشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔

امام صاحب فرماتے ہیں۔

"نبوت انسانیت کے مرتبے سے بالاتر ہے، جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے۔ وہ عطیۂ الٰہی اور موہبت ربانی ہے، سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ (انعام-۱۵)

اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیغمبری کا منصب رکھے۔

﴿وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ [شوریٰ-۵][2]

اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ دکھائیں۔

اس موقع کے لئے صریح آیت یہ ہے

﴿ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ﴾ [جمعہ-۱]

---

[1] معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔

[2] امام صاحب نے آیت پوری نہیں نقل کی ہے ہم نے اپنی طرف سے آیت پوری کر دی ہے۔

یہ [نبوت] خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل ہوں اور ریا و شہرت طلبی سے پاک ہوں نفس میں مقام وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں اسی طرح نوع انبیاء کا نبی بن جانا ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاض عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لئے اس کو یقیناً محنت و جد و جہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نبوت نوع انبیاء کے لئے اکتسابی چیز نہیں لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لئے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق آخری پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کی۔ ایک نبی بیٹھا ایک ایک چلہ اسی طرح گذارا کہ وادی و دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے۔ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے، اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت ﷺ کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے حرا میں جا کر جب عبادت میں مشغول ہوتے تو رویائے صادقہ دیکھتے جس کی سچائی صبح سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی۔ وحی کے بعد آپ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے، اس لئے قرآن نے آپ کو خطاب کر کے کہا۔

﴿طٰهٰ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ﴾ (طٰہٰ-۱)

اے پیغمبر ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لئے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسن صورت، اعتدال مزاج، شہوتوں کی پاکی، حسن تربیت، طہارت نسب، مکارم اخلاق، نیک طینتی، متانت، سنجیدگی، وقار، شان علمی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنان حق کے ساتھ شدت قوت پائی جائے، علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار، تمام برائیوں سے پاک، فضائل و محاسن سے آراستہ اور رذیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قرابت مندوں اور عزیزوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریاد خواہوں کی فریاد رسی اس کی طبیعت ہوتی ہے، نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے۔ اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ۔

﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ﴾ (نجم-۱)

تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا اور نہ بہکا۔

بھی عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کرسکتا ہے یا کوئی نہیں کرسکتا' یا بعض کرسکتے ہیں اور بعض نہیں۔ پہلے دو احتمال بداہتہً غلط ہیں۔ اب رہ گیا تیسرا احتمال یعنی بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کرسکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے۔ جس شخص کو خالق فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے، وہی پیغمبر اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ:

نوع انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے۔ اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے، نہ جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت ہوسکے۔ اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے۔ انسان کو اس کے لئے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تعاون کہتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ برے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں، اس کو تمانع کہتے ہیں۔ اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے اور رہنے کے لئے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے۔ تعاون کے ذریعہ نکاح و قرابت اولاد و اعزہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی اور ان کی دولت و جائیداد اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس تعاون اور تمانع کے اصول ضرور ہے کہ مرتب' محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی خاص شخص' خاندان' قبیلہ' قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الٰہی سے بن سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہرحال کوئی خاص شخص' یا کسی خاص خاندان' قبیلہ' قوم اور ملک کا ہوگا ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لئے یکساں واجب العمل ہو، محال ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں، جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسان کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے۔ یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں، وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ:

یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی۔ پہلے یہ جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں۔ خلق (پیدا کرنا، نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود و ہست ہے، اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات الٰہی دو چیزوں سے عبارت ہے۔ تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد

پیدائش اور پیغام رسانی کی واسطہ ہیں اسی طرح پیغمبر خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان بجز پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین کر لئے جائیں۔

۱۔ چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لئے ممکن کے وجود میں آنے کے لئے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے۔ یہی مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

۲۔ ہر قسم کے حرکات کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو مبدء حرکت کی تجدید کرتا رہے۔ حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے اسی طرح طبعی حرکت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو۔ آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم ان کو حرکت دینے کے لئے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے اسی لئے قرآن نے ان کے لئے کہا۔

﴿ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ﴾ (حم السجدہ۔۲)

خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔

۳۔ اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آسکتیں اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال و حرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

۴۔ خدا کے حکم دو قسم کے ہیں تدبیری اور تکلیفی۔ پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور نظم کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے

﴿ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ﴾ (اعراف۔۵۴)

اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں۔ اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔

تکلیفی حکم صرف انسان کے لئے ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ﴾ (بقرہ۔۲۱)

اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔

مقدمات مذکورۂ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں اس لئے مرجح کی ضرورت ہے۔ اختیاری ہیں اس لئے عقل کی ضرورت ہے۔ خیر و شر کے محتمل ہیں اس لئے رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے۔ اسی قیاس سے انسانوں پر خدا کا جو

تکمیلی علم کا ماخذ ہے وہ بھی ایسے ہی نفوس کے ذریعہ سے ہوگا اور انہیں کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے پچھلے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے۔ شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت:

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں' بہیمی اور ملکوتی۔ کھانا' پینا' شہوت' حرص وطمع' استیلاء و جبر وغیرہ افعال' بہیمی قوت کے آثار ہیں۔ اور غور وفکر' علم ومعرفت' حسن اخلاق' صبر وشکر' عبادت وطاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں۔ انسان کی روحانی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو۔ اگرچہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کرسکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ وعصیاں کے نقصانات ظاہر ہوں۔ عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کرسکتا ہے مگر یہ تو امکان عقلی ہے۔ عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ' حرص وطمع' اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو برتو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے' اسی طرح اندرونی وجدان واحساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق وباطل خیر وشر اور نیک وبد کی تمیز کو بھول جاتا ہے' اس لئے نوع انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس ووجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد' جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح وآشتی اور امن وامان پیدا کردے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق' اس کے حقوق وفرائض کی تعیین کرے۔ ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں' اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال۔ انسانوں کے معمولی پیشوں' نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو ان کاموں کا خاص ذوق ووجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول وقواعد وضع کئے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارج علیا تک پہنچے پھر اخلاق اور روحانیت اور ملک وملت کے مصالح وفوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے' کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس وناکس کا کام ہو سکتا ہے؟

نبی کی عصمت:

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول وقواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو۔ اس کو ان امور کا علم اسی

طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے۔ کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے، کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر، بد و نیک اور دیانت و امانت کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقلی مبادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک و پیاس نہیں ہے ہم کبھی اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو خطا نہیں کہہ سکتے ٹھیک اسی طرح ان نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق ودیعت رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ حق ہی ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت:

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربے سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں ان سے اس کا تقرب بارگاہ الٰہی میں بھی ظاہر ہوتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی "بعثت نبوت" کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے:

مفہمین:

فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور پکے جذبے سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہ الٰہی سے ایسے علوم اور حقائق کا ترشح ہوتا ہے جن میں روحانی آثار نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ادراک میں متوسط ہوتے ہیں۔ نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ تجریدات اور تخیلات میں مبتلا رہیں۔ سچی فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، افراط و تفریط ان سے بعید ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و اطاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عامہ اور نوع کی بھلائی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ بلاواسطہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے اور اگر منفعت عامہ کا حصول اور بڑی چیز کا فائدہ بغیر چھوٹے سے نقصان کے حاصل نہ ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنان عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لئے قرب و ملکیت کے دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے۔

معلمین کی اقسام:

معلمین کی درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کی مختلف استعدادیں ہیں اور اسی بناء پر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں۔ جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیب نفس کے علوم پاتا ہے وہ کامل ہے اور جو اخلاق فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے وہ حکیم ہے، جو ملکی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملاء اعلیٰ کا نزول ہو اور وہ ان سے تعلیم پائے اور وہ اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں، وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں وہ نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقاء خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں، اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہلائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبت عظمیٰ سے خبردار کرے جو اس دنیا میں ان کے لئے ان کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر مقدر ہے اور ان کی بداعمالی کے سبب ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کی جو دوری یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اس کا نام منذر (ڈرانے والا، ہوشیار کرنے والا) ہے۔

اور جب حکمت الٰہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ خلق کی ہدایت و اصلاح کے لئے ان معلمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد خلق کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہ الٰہی میں تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے اس سے خوشنودی اور جو اس کی مخالفت کرے اس سے ناخوشی ظاہر کرے۔ یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں:

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس قسم کی بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مراد الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے مامور کی بعثت ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (جمعہ-۲)

وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران۔۱۱۰)
تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لئے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے۔

﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (حج۔۷۸)
تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپ نے صحابہ کو فرمایا ﴿فانما بعثتم میسرین و لم تبعثوا معسرین﴾ تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تنگی کرنے والے بنا کر نہیں۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن آنحضرت ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام شئون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیئے گئے اور آپ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب:

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لئے حکمت الٰہی کا اقتضا اس لئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے، وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے، اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لئے بارگاہ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ:

اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں کیونکہ یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لئے قائم کی جائے تاکہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس کے دین کو درست کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی، یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و

مصلحت برقرار رہے تو یکے بعد دیگرے نبی پیدا ہوتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی تبلیغ کی کامیابی:

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی دے اور اس کے دشمنوں کو پسپا کرے (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴾ (الصّٰفّٰت۔۱۷۱)

اور ہماری بات اپنے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر جتنی وسیع ہوگی ان کو ان اصولوں کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے جس طرح نفسیات و اجتماع (سائیکالوجی آف سوسائٹی) یا نفسیات رہنمائی (سائیکالوجی آف لیڈر شپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں۔ اسی طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ "نفسیات نبوت" کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرز گفتگو، اسلوب تحریر اور طریقہ استدلال غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اہل زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیے جائیں ان پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں پہلوؤں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار رہے۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سر مو انحراف نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لحظہ اسی میں مصروف ہے۔ زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے۔ ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ خوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا وہ اس کو انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں۔ بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا چلتا پھرتا اٹھتا بیٹھتا زندگی گذارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ یہ

اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے؟ اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان؟ اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لئے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے۔

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا﴾ (مومنون۔ ۶)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے۔

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى﴾ (قیامہ۔ ۲)

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحے سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح اچھلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، سبزے اسی طرح اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے۔ لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے، پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے، اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے، نہ سبزیاں اگیں، نہ نباتات ابھر آئیں، نہ پانی بہہ کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو۔ الغرض دنیا کی کوئی اہم ہستی اپنے وجود کے لئے انسان کی محتاج نہیں لیکن انسان اپنے وجود کے لئے کارخانۂ ہستی کے ایک ایک پرزہ کا حاجت مند ہے تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے جو تمام موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک اسی امر کو موجودات و مخلوقات کی نسبت یوں کہتا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (بقرہ۔ ۳)

اس نے تمہارے لئے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

پھر یہ بھی بتایا۔

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ﴾ (حج۔ ۹)

(اے انسان!) کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے ان سب کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ﴾ (نحل۔ ۲)

اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو، سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا۔ ستارے بھی اسی کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

ہستیاں دو ہی ہیں خالق کی اور اس کی مخلوقات کی۔ مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں

ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آرہی ہے۔ جمادات نباتات کے، نباتات جمادات کے اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آرہے ہیں۔ آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہئے۔ مخلوقات میں تو اب اس طرح کی کوئی اعلیٰ ہستی نہیں تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے۔

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض وغایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا، زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (ذاریات۔ ۵۶)

اور میں نے جن اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں

عقل وفہم اور ارادہ واختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں جیسے آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت

۲۔ دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم وفہم رکھتے ہیں لیکن قیاس واستقراء وتمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے۔ ان کا ارادہ واختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے جیسے حیوانات۔

۳۔ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل وادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقراء اور تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا، اسی لئے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار اور حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار جبلت فطرت اور طبیعت کہتے ہیں ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں جیسے حیوانات کے افعال اور ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح اور وہ بھی کسی غایت اور انجام ومآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت وجبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطراراً سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال وحرکات تمام تر اس کے ارادہ واختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں۔ صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر وشر اور نیک وبد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی، انجام اور مآل کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔

جن وانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر وشر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات ونباتات تو اس لئے کہ

ان کے افعال و حرکات تمام تر مجبورانہ بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب پیدا ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دن دے دیئے ہیں۔ حیوانات بھی اس لئے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال و حرکات بھی تمام تر جبلی و طبعی ہیں اور وہ جبلت و طبیعت پر مجبور ہیں، بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں۔ اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لئے ان سے عصیاں نہیں سرزد ہوتا۔ صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ و اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی بدی اور خیر و شر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھ کر مآل کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے تحت کوئی کام کرتا ہے اس لئے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لئے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا ہے۔

جمادات و نباتات اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے۔

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ (النحل ۴۹)

اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے چارپایوں میں سے اور فرشتے وہ سرکشی نہیں کرتے اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔

اسی فطری اطاعت الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھا جیسا کہ قرآن میں ہے

﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ﴾ (النحل۔ ۶۹)

اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھتے ڈالتے ہیں اپنے لئے گھر بنالے پھر ہر پھل میں سے کھا پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل مطیع ہو کر۔

دیکھو اس آیت پاک میں شہد کی مکھی کی الہامی مجبورانہ پیروی کو اطاعت الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ان کی اپنے خالق و پیدا کرنے والے کے حکم کی۔ اسی جبلی اطاعت اور فطری عمل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (النور ۴۱)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اور اڑتے جانور پر کھولے اسی کی یاد کرتے ہیں۔ ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔

لیکن انسان کو دوسرے موجودات و مخلوقات کی طرح مجبور محض پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتا دیا جا چکا ہے وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں خفتہ اور حیوانات میں متحرک ہے وہ انسان میں پوری طرح بیدار

اور کارفرما ہے۔ اسی طرح وہ ارادی قوت واختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے وہ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے۔ علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی ارادی ''تکلیف'' کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت الٰہی کے لئے نہیں بلکہ بالارادہ اطاعت کے لئے اس کی تخلیق ہوئی۔ فرمایا:

﴿ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ﴾ (احزاب۔۷۲)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

یہ امانت اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجے کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہوا ہے انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بالارادہ اور بااختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت وجبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح بالارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال وحرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام ووحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں، اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام ووحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام واوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو۔ انبیاءؑ اور رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور ہیں اور کسی قدر بااختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں، خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے' فرمایا:

﴿ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ (حج۔۱۸)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے' اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان' اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھیر چکا ہے۔

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص بالارادہ اور باعقل اور انجام بین انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں، مطیع اور سرکش۔

کائنات کی حقیقت کا ذرا بھی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں سے جس صنف
مخلوقات میں احساس، ارادہ اور اختیار کا دائرہ اضافہ ہستی میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر معلم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ
کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنف کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے۔ جمادات اپنی نشوونما کے لئے بیرونی غذا
کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف ابتدائی شکل میں کھلتی ہے، ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے
ہوتی ہے اور وہ خود اوپر چڑھ کر اور پھیل کر ان تک پہنچ جاتی ہے۔ حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں ان کی
غذا بے جوڑے رہے ہوتے ہیں۔ بے چینے کھا رہے، ان کے پالے جو قدم پر ہر وقت تیار رہتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں
اوصاف پوری طرح حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس
کی جد و جہد محنت اور جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے نکل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔

جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے اسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکمرانی کی حکومت زیادہ قائم
ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر
حس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناقابل
تغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔ جمادات بھی وہی
کریں گے جو ان کو کرنا چاہئے، نباتات بھی وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہئے۔ حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے
سپرد کر دیا گیا ہے۔ لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حد و اعتدال سے قدم باہر
نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے۔ انبیاء اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ
کے حکم سے اس ذی ارادہ اور بااختیار مخلوق کو اس کی ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔

اس اختیار اور ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں "دل" ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی
رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک ساری جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں
سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے۔ انبیاء اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر بیشمار چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے۔ ان
چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لئے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاض قدرت
کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ
ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے
ذریعہ سے فن و قسم کی ایجادات اور اختراعات کئے جاتے ہیں، ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو انجام دیتا ہے اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری
ضرورت کے مطابق تمہارے لئے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض
ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سکھایا ہے، بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے
کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر ویسی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں

بنانے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک انہیں کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ازالۂ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لئے خالق فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اپنے اپنے کام کو انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا، جن کو تم اصول تمدن، طریقہ معاشرت، آئین عدل و انصاف، اخلاق حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو، دور شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا جھنڈ بن جائے۔

جو تمہارے لئے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے اور جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سنار ہے، جو تمہارے کپڑے بنتا ہے وہ جولاہا ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صنعتوں سے تمہاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے اور جو تمہارے لئے مادی کائنات کے چہرہ سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگران ہیں وہ ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہارے مادی ضروریات کے بنانے والوں کے لئے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں یہ عام علماء ہیں۔ بعض وہ ہیں جو اگلے روحانی نسخوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی صحت پر اجتہاد کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں یہ مجتہدین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے لئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ انبیاء ہیں۔ ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لئے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بنانے، اوزار بنانے اور صناعی کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لئے ہیں۔ ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان ناسوروں پر پڑتی ہیں جن سے صدہا قسم کے نقصے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دلوں کی رگوں پر۔ غور کرو کہ یہی اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال، افعال اور ہر قسم کی حرکات و سکنات اور ہر طرح کی جد و جہد کا مدار ہے یعنی "دل" کیا انبیاء اور ان کے متبعین کے سوا نوع انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشو و نما، حفاظت، ترقی، تکمیل اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالق فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ مادی ترقی و اصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی و اصلاح کی بھی فکر کرتا ہے اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوع انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے، کیا اس کی شان ربوبیت کے ساتھ سوء ظن نہیں ہے؟

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سانچا بنا لایا ہے، وہ ان

سب کو جو تمہارے لئے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں اور نسل سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت و غربت، سوسائٹی اور مجلس، دار حکومت اور اقلیم اور جغرافی و قومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوام عالم کو اولاد آدم اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں اور ان کے اخلاقی و روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن و امان پیدا کر دیتے ہیں، ان کے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر الفت و محبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح و غلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ طبقہ ہے جس کو ہم نبی و رسول اور پیغمبر کہتے ہیں ان کو براہ راست جسم و جسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لئے جسم و جسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اسی حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح کے لئے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

اس مقام پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ افراد انسانی کے درمیان امن و امان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا کام ایک معلم بھی کرتا ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے۔ علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلاف نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے۔ کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، مگر اس کی زندگی اور اسباب زندگی پر غور کیا جائے تو بایالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قویٰ اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے اور اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے مخصوص افعال و اعمال کے حدود اور ان کے اسباب و علل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ اتھکس (فلسفہ اخلاق) ہے، اگر اس کے اجتماعی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع و معاشرت) ہے، اگر جسم کی صحت و مرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں؟ تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور بایں ہمہ ان میں سے ہر ایک علم و فن علیحدہ اور ہر ایک علم و فن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا دعوے دار ہے کہ وہ اپنی زور و قوت

سے باز رہیں، مجلسوں، آبادیوں اور سیاستوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھیں۔ علمائے اخلاق انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب وعلل کی تفتیش اور ان میں نظم و تسلسل اور علت و معلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے۔ فلسفہ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق و عادات کے اسباب وعلل تم کو بتاتے اور تمام تمہارے جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں۔ حکیم اور واعظ تمہارے اعمال واخلاق کی اصلاح کے لئے نہایت شیریں خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کو رہنما ہو۔ جو تمہارے احساس ارادہ اور اختیار کے قدم کو بد روی سے روک سکے۔ وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب وعلل بتاتے بلکہ تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم و تلقین و فیض صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ خود دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کردے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کردے۔ البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے۔ وہ انسانوں کو اس کے احساس ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان قوتوں کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کردیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجلسوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے۔ وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب وعلل کی تلاش و جستجو کی تشریح کی پروا نہیں کرتا بلکہ اخلاق سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسوم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرکے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے۔

﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (اعراف۔ ۱۵۷)

وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بوجھ اور ان بیڑیوں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔

﴿رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (نساء۔ ۲۳)

ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہوشیار کرتے ہیں تاکہ رسولوں کی اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے (کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا)

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (حدید۔ ۲۵)

ہم نے رسولوں کو کھلی باتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں اور (دنیا میں امن و اطمینان کی زندگی بسر کریں)

نوع انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیاء اور رسول نوع انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی

﴿ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ﴾ (نجم: ۱۔۱۸)

قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا، نہ بہکا اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے۔ وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ سے کہا جاتا ہے۔ اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا طاقت والا تو وہ سیدھا ہوا اور آ نمایاں ہوا وہ آسمان کے سب سے اوپر کناروں میں تھا تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی۔ جو وحی کی تھی اس کے دل نے جو اس نے دیکھا اس کو جھوٹ کہا؟ کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو۔ نہ نگاہ نے کجی کی اور نہ سرکشی کی اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴾

(سورۂ اعراف۔۲۰۳)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ یہ (اے انسانو!) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہیں۔

﴿ وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ﴾ (شعراء۔۱۹۲۔۱۹۵)

یہ تو عالم کی پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا کہ فصیح عربی زبان میں تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو۔

نکتہ:۔ بالکل ممکن بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں۔ کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں۔ خود غرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کر کے صرف مخلصانہ اغراض کو لو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے، کوئی رسم و رواج اور معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے، لیکن انبیاءؑ کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت و جلال کا ہر منظر خود ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے، مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت و طاقت ان کا مطمح نظر نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی خوشنودی ہوتی ہے۔ باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات:

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے۔ مبدا اور منبع کا فرق، غرض و غایت کا فرق، طریق دعوت کا فرق اور علم و عمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدا و منبع، خدا اور سرچشمہ جو کچھ ہو وہ تعلیم ربانی، شرح صدر اور وحی و الہام ہوتا ہے اور حکیم کے علم کا ماخذ و منبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ، استقرا اور قیاس سے ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جڑتا ہے اور نبی خالق عقل سے۔ اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشاء اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضا مندی کے لیے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے۔ طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت تمام تر عقلی مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے۔ حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لئے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لئے ضروری ہے۔ وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت و خلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دیو جانس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

دنیا اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے دنیا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں۔ حکمائے فلسفہ اور بڑے بڑے فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بات تسلیم کریں لیکن پیغمبر اپنے پیرووں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں۔ وہ اگر کبھی قانون و حدود و سزا کو نافذ کرتے ہیں یا ساتھ ہی ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے اور لیکن اصلی مقصد ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیرووں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں، بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے تختے الٹ دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار جما یا، ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں اور جنگلوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا، اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا لیکن کیا انہوں نے دلوں کے چھپے بھی الٹے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم کو منوا سکے؟ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضہ اقتدار میں لا سکے؟ وہ آبادیوں اور جنگلوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن و امان پیدا کر سکے؟ وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم و نسق قائم کر سکے؟

حکماء اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے کائنات عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں، کیا وہ قلب و روح کے کائنات کو دریافت کر سکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ

انسانوں کی اصلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی ثبوت ہے؟ ارسطو نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی اور دوسرے حکماء نے اخلاق کے اسباب و علل کے حدود نظم و آثار و نتیجے کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا اور بھلائی کے بیج نے نشوونما پائی ان کے اخلاقی تعلیمات کے فلسفیانہ رسوم و اسرار کا دائرہ ان کی درسگاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب تماشا گاہوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور عملی معیار عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی۔ حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں مگر کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جو بازاری فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا وہ ان کے پیشے کے فروغ اور کامیابی کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور توحید و خدا پرستی تو اس سے بدرجہا بلند ہے جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر سحر البیان خطیب، ہر فیلسوف مقنن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ دان حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے۔ اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شرائط لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں:-

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق براہ راست عالم غیب سے ہو۔ وہ عالم غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، عالم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہم سفر و ہمنوا ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لئے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

۳۔ اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں جن سے اس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

۴۔ فضائل و اخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے۔

۵۔ وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روز الست کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

۶۔ نہ صرف تعلیم بلکہ اس میں قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راستہ پر چلا دے اور جو خدا سے بھاگے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

۷۔ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے سچے اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے۔

۸۔ اس کی دعوت و جدوجہد اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دنیوی جاہ و عزت، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلق خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت و رسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مذاہب

عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے خصوصاً قرآن پاک سے جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے۔ جس نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے۔ سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْــَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴾ (انعام۔ ۸۳۔ ۹۰)

اور یہ ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کر دیتے ہیں بے شبہ تیرا پروردگار حکمت والا خبردار ہے۔ اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰق اور یعقوبؑ بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوحؑ کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں، اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو، ہر ایک نیکوکاروں میں سے ہے اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر، اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے، اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ (کا علم) اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں سے انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے لوگوں کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اے محمدؐ! تو بھی انہیں کی ہدایت کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دلانا ہے۔

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں۔ اگر ہم ان کو یکجا کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں گے۔

۱۔ فرمایا "ہم نے ابراہیمؑ کو دلیل دی" "اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی" جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ ملکوت سے ملتا ہے۔

۲۔ ارشاد ہوا کہ "ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا" اور "یہ سب نیکوکار تھے" اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

۳۔ یہ بھی کہا کہ "ہم نے ان کو چن کر پسند کیا" اور "جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے یہ ہدایت عطا کریں"

جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدائی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

٣۔ فرمایا کہ "ہم نے ان کو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی" اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

٥۔ حکم ہوا کہ "ان کی رہنمائی کی پیروی کر" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکی کا راستہ پا سکتے ہیں۔

٦۔ فرمایا کہ "اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا۔ یہ تو اہل دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے" اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصود اور مطمح نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ ﷺ کے تعلق و نسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ تصریح بیان کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں:

١۔ اشیائے غیب امور خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدائی تعلیم سے کامل ہو۔

٢۔ وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

٣۔ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

٤۔ اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ کی نسبت یہ فرمایا گیا ہے۔

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (بقرہ۔١٥)

وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کو یکجا ذکر کیا ہے۔ جاہلوں کو آیات الٰہی پڑھ کر سنانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الٰہی پڑھائی اور کتاب و حکمت سکھائی گئی ہو۔ اور دوسروں کو پاک و صاف بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود پاک و صاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا۔ ایک دوسری آیت میں ہے۔

﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴾ (اعلیٰ۔١)

ہم تجھے پڑھا دیں گے تو تو نہیں بھولے گا مگر جو اللہ چاہے۔ وہ جانتا ہے پکار کر کہا اور جو چھپا اور ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچا دیں گے۔ اور تو سمجھا اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے۔ جس کو خدا کا ڈر ہوگا وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

پہلا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو "پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے" اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لئے اس مشکل منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام

خیر اس سے بہ سہولت از خود صادر ہونے لگتی پھر اس کو دنیا کے "سمجھانے" پر مامور کرنا اس امر کو آشکارا کرتا ہے کہ دوسروں کی تعلیم و تذکیر کا منصب اس کو ملا ہے۔ اس کے بعد یہ فرمانا کہ "متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بدبخت محروم رہیں گے" اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق فیض پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔ [1]

نبوت کے لوازم اور خصوصیات:

نبوت کی شرعی حقیقت اور اس کے ضروری لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدباب ہو۔ لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو "خصوصیت" کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے؟

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں۔ یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ انہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں۔ پھل، پھول، چوپائے، پرندے اور انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں خصوصیات کی بناء پر ہر نوع دوسرے سے ممتاز اور ہر صنف دوسرے سے علیحدہ ہے۔ گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو، خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں۔ لیکن گلاب کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علاحدہ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں۔ مثلاً دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں مٹھاس، حنظل میں کڑواہٹ، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہوگئی ہیں اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرتاً ودیعت ہیں لیکن اس وصف انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوع انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی اور یورپین وغیرہ۔ دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل اور اخلاق و عادات وغیرہ حیثیتوں سے ان کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام اصناف انسانی جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنف انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں۔ خالق فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں۔ شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، منطق، باغبانی، معماری، پہلوانی، سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی

1 یہ تشریح اور طریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں۔ ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے ادب و انشاء کے خیالی بلند پرواز عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے ادب و شاعری سے بیگانہ پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنف شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے۔ نظم کی قوت' تخیل کی بلندی' محاکات کی قدرت' الفاظ کا زور' معانی کا جوش' یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں۔ اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے۔ خاموشی' غور وفکر' وقت نظر' خارجی عالم سے بے پروائی' تصور میں انہماک' خلوت گزینی' اخلاق کی خشکی' الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بناء پر جو اصناف انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے۔ ہنی بال و نپولین و چنگیز دم کے دم میں آبادی کو ویران اور ویرانہ کو آبادی پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفہ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے۔ افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا' مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر بھی کلہاڑی نہ مار سکا۔ اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا' دریاؤں کو پھاڑتا' اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا' غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ نوع انسانی میں اشتراک کے باوجود اصناف انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم و صنف کے الگ الگ خصوصیات' صفات اور لوازم ہیں۔ انہیں مختلف اصناف انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوع انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف خصوصیات اور لوازم ہیں جو ان کو دوسرے اصناف انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں۔

وہبی استعداد:

ان میں سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں اور انہیں کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار و خواص' پھل' اس کا مزہ' اس کا رنگ و بو' غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہی تخم پودا بنتا ہے' پودا بڑھتا ہے' کونپل اور شاخیں پیدا کرتا

ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار و خواص اور کیفیات اس میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کہ "میں اس وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب و گل میں تھا[1] اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلوٰت اللہ علیہم کے حالات و واقعات قبل نبوت پر ضرور ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی۔ حضرت ابراہیمؑ کا نبوت پانے سے پہلے ہی آسمان و زمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسمٰعیلؑ کا بے آب و گیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کی تیاری اور اس کمسنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری آمادگی اور صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحاقؑ کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غلام علیم (حجر-۴) کا خطاب پانا، پھر مقدس باپ کی جانشینی اور یروشلم کی مسجد کی پاسبانی کے لئے انتخاب کس مقصود کا دیباچہ ہے؟

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رویائے صادقہ اور صبر و شکر اور پاکدامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰؑ کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے فرعونیوں سے تن تنہا بچاؤ اور آزمائش کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا آغاز عمر میں علم و فہم، فصل مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰؑ کی دعائے پیدائش، بچپن ہی میں ان کی نیکی، سعادت مندی، نرم خوئی اور پاکی کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، توراۃ کی حقیقت رسی کس روز روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے دعائے خلیل، نوید مسیحا، رویائے آمنہ اور احوال ولادت و تربیت، مراسم شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، امانت، آثار خیر و برکت، نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خورشید جہانتاب کا مطلع انوار ہے۔

---

[1] جامع ترمذی مناقب نبوی و مستدرک حاکم، مناقب محمدؐ، جلد دوم صفحہ ۶۰۰ حیدرآباد۔

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہے۔

﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

(الصّٰفّٰت۔ ۱۰۱۔۱۰۲)

تو ہم نے ابراہیم کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ خطاب ہے۔

﴿ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴾ (طٰہٰ۔ ۳۷۔۳۸)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب (تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق) تیری ماں کے دل میں وہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت یہ ارشاد ہے۔

﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ ﴾ (مریم۔ ۱۲۔۱۵)

اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی اور تھا پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمان بردار اور نہ تھا زبردستی کرنے والا نافرمان۔ سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔

نیز حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے۔

﴿ كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ﴾ (مریم۔ ۲۹۔۳۰)

ہم کیسے اس سے بات کریں جو ابھی گہوارہ میں بچہ ہے؟ عیسیٰ نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب الٰہی دی اور مجھے نبی ٹھہرایا اور مبارک بنایا میں جہاں ہوں۔

اور مکہ کا "الامین" نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے۔

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (یونس۔ ۱۶)

تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

انبیاء علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم:

نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان احساس یا عقل و قیاس سے

نہیں بلکہ براہ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوۃ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ:

علم انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی واسطے سے حاصل ہوتا ہے۔ بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ **وجدان** انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک' پیاس' بیماری' صحت' غم' خوشی' خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

۲۔ **فطرت** اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔ ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطے کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علماء کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں "جبلت" کہتے ہیں۔ حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرتاً ہوتا ہے پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے؟ آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے؟ شیر کے بچے کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا؟ انسان کے بچے کو پیدا ہوتے ہی رونا' سونا' دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے؟

۳۔ **بداہت** انسان کے کچھ ہوش وتمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا ادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک وشبہ راہ نہیں پاتا۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں' برابر کا برابر برابر ہوتا ہے' ایک وقت ہی میں ایک ہی چیز سیاہ وسپید دونوں نہیں ہو سکتی' ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے' وغیرہ۔ بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے اس کو بداہتاً معلوم ہو جاتی ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں۔ اس کے بعد علم انسانی کی دو قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطے سے ہوتا ہے انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں' ایک احساس اور دوسرا عقل۔ پہلے سے وہ گرد وپیش کی مادی چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج میں موجود نہیں بلکہ عالم غیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں' علم حاصل کرتا ہے۔

۴۔ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں۔ باصرہ' سامعہ' شامہ' ذائقہ' لامسہ۔ باصرہ دیکھتی' سامعہ سنتی' شامہ سونگھتی' ذائقہ چکھتی اور لامسہ چھوتی ہے' انہیں کا نام حواس خمسہ ہے۔ انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آکر ٹکراتی ہیں' اسی کا نام احساس ہے۔ ہم چکھ کر مزہ پاتے' سن کر آواز پہچانتے' دیکھ کر صورت جانتے' چھو کر سختی ونرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو

معلوم کرتے ہیں۔ ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی بھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں اور دریافت کرنے میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔ بیماری میں قوت ذائقہ بدل جاتی ہے اور اس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے تیز حرکت میں قوت باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھیری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھیرا ہوا معلوم ہوتا ہے متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا در حقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں؟

۵۔ علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد در حقیقت انہیں معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان الہام فطری (یا جبلت) بداہت اولی اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور انہیں معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقراء کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امر کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں، اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقراء پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکا دیا ہو یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو۔ طبعیات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کئے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا "مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات و بدیہیات و محسوسات پر علی سبیل قطعیت مبنی ہو" مابعد الطبعیہ اور فلسفہ الہیات کے مسائل اسی طریقہ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لئے ان میں اختلاف کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے۔ مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق ہو سکتا ہے، غور و فکر بحث و نظر تحقیق و جستجو اور ترتیب مقدمات جو اس قیاس کے عقلی کارکن اور عامل ہیں، وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں اس لئے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب:

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے ہم کو جو بھوک یا پیاس لگتی ہے، کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے یہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو یا ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو؟ کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہے؟ اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات وفطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا' سننا' چکھنا' سونگھنا' چھونا' یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آ سکتا۔ یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں کیونکہ وجودی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔

محسوسات کے بعد بدیہیات اولیہ کا درجہ آتا ہے۔ انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے۔ دو دو چار ہوتے ہیں' دس پانچ کا دونا ہے' ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہو سکتی' ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ وسپید نہیں ہو سکتی' ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز و رشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے' اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو۔ فطری احمق اور بے وقوف انہیں کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات' فطریات' بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کو معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں اور دوسری طرف (سمت کمال میں) عاقل' عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا۔ ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب انہیں عقلی مدارج کے مختلف انسانی افراد ہیں۔ بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پر خطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔

عام طور سے انسانی علم کے پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے۔ غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے' دوسرا یعنی فطریات کا علم' خالق فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے' تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں' آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترک فیصلہ ہیں' پانچواں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے مادی قوی کا عمل ہے۔ تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے' وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں' محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں' بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہیں مشترک تعلق رکھتے ہیں یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بیچ بیچ ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا مادہ سے تعلق بہر حال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم:

اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے۔ وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے۔ اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ عالم مادی (دل و دماغ) کے آئینہ پر اوپر سے آ کر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی اور روحانی سے لے کر پھر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔

فراست کے لفظی معنی "تاڑ جانے" کے ہیں۔ تاڑ لینے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی سے انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا تھا مگر دیکھتا نہ تھا۔ ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے۔ اسی طرح ہر علم و فن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اخیار اور نیکو کاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

﴿اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله﴾ (ترمذی)
مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔

۲۔ فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے۔ فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور انہیں ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے۔ یہ چیز بھی ایک کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو

نصرت عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور مقتداؤں اور داعیان روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

۳۔ کشف کے لفظی معنی کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے کوئی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے۔ عام لوگوں کو سمجھنے کے لئے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خواب عالم خواب کی بات ہے اور کشف عالم بیداری کی۔ جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں تو ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے۔ ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گذرتے رہتے ہیں۔

۴۔ الہام کے لفظی معنی "دل میں ڈالنے" کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آ جاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجے کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آ جاتا ہے۔ کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین علماء، شعراء اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے نئی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

۵۔ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشاء کو کسی دوسرے پر بغیر الفاظ اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہے اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشاء سے اپنے خاص بندوں کو کسی بھی ذریعہ سے مطلع کرتا ہیں۔ یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لئے ذریعہ یقین ہیں، اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لئے یقینی ہیں اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان، پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات اسی طرح علم کے روحانی وسائل میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی، پھر الہام، پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف یہ قرآن پاک کی اصطلاحی قسمیں ہیں اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمہ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ وحی (اشارہ) سے بات کرنا یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آ جانا۔ اگر یہ حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے، اگر خواب میں ہے تو رویا ہے۔

۲۔ خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہو۔

۳۔ فرشتوں کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں۔ وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ﴾ (شوریٰ)

اور کسی آدمی کو یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے اس کو وحی کر دے، بے شک خدا بلند حکمت والا ہے۔

مکالمہ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالی مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ مقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقہ سے بھی آنحضرت ﷺ کو کچھ تعلیم و اطلاع دی گئی ہے اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمہ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے۔

﴿مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (نجم-۱)

نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

الغرض اسی امتیاز کے لئے ہمیں اصطلاح میں ان تینوں طریقوں کے لئے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیئے گئے ہیں تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقہ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے۔ بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رویا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔[1]

نکتہ:۔ اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تینوں طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگان خاص کو عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمائے۔

بہرحال غیبی ذریعہ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پراسرار اور ناقابل فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین ذریعہ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن

۱۔ ان اصطلاحات کی بحث کے لئے بعض اہل تصوف کی کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے مگر اس موقع پر [illegible] کی تشریح [illegible] اصطلاح المعراج الصوفی ۶-۷ جلد دوم ص ۱۴۹۵ مطبوعہ بولاق مصر ۱۳۱۸ھ بھی دیکھنی چاہئے۔

میں آ سکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپریچولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب وکلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر۔ انبیاء کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات ومحسوسات کا علم ہوتا ہے۔ جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے، اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات شبہ نہیں ہوا کرتا غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب:

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ قرآن میں بار بار آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے۔

﴿ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ ﴾ (یونس۔۲)

تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لئے ہے۔

﴿ قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ ﴾ (نمل۔۵)

کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔

رسول کہتے ہیں۔

﴿ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ ﴾ (انعام۔۵)

اور میں غیب نہیں جانتا۔

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہاں ہم خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔

سورۂ جن میں ہے۔

﴿ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ﴾ (جن)

تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے۔

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا، لیکن ہاں اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے۔

ان دو آیتوں میں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیۃً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرما دیا گیا۔

﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ﴾ (بقرہ۔۳۴)

اور وہ خدا کے ایک ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے۔ بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان کا علم کسی کو نہیں مثلاً قیامت، بارش، موت، شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی، کل کیا ہوگا ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کے بعض عذر خواہ اصحاب کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی۔ خدا نے فرمایا

﴿ عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ ﴾ (توبہ۔۷)

خدا نے تجھ سے درگذر کیا۔ کیوں تو نے ان کو اجازت دی تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو جان لیتا

﴿ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ كَارِهُونَ ﴾ (توبہ)

انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے یہاں تک کہ حق بات آگئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔

آگے چل کر ہے۔

﴿ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ﴾ (توبہ۔۱۳)

یہ نفاق پر اڑے ہیں، تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیئے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں "رسول" ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت:

علم غیب کے اس ناہموار راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں؟ قرآن مجید کے اس الفاظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کے اجمالی

اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں۔ اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا۔ گذر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان، حواس اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں۔ ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قوی کی نگاہوں کے سامنے غائب ہیں، اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے (انعام، رعد، حشر، تغابن) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے۔ الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملتا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے۔

"زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے کہ تو تحریر و روایت کے ذریعہ لیکن جس کے لئے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لئے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔"

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَٰذَا﴾ (ہود۔۴)

یہ غیب کی بعض خبروں میں سے ہے، ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف۔ نہ تو ان کو پہلے سے جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ﴾ (آل عمران۔۵)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا اس کی آنحضرت ﷺ سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا۔ اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا۔

﴿ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ﴾ (یوسف۔۱۱)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام

طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا۔ بہر حال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے۔ ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے۔ قرآن پاک میں ایک موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا۔

﴿ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴾ (یونس)

تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لئے ہے انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا گیا ہے۔ اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ (لقمان۔۳)

خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے

﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ﴾ (اعراف۔۲۳)

وہ قیامت کو پوچھتے ہیں کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے۔

﴿ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ﴾ (لقمان۔۳)

کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا؟

۳۔ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں تاہم انسان کے حواس حس اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا۔ ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لئے کسی نہ کسی مسافت عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے۔ ہم دلی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں اس لئے زمانہ حال کے علم کے لئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ان کے بغیر جو علم حاصل ہوگا وہ غیب ہوگا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں کیا ہے؟ کس کو معلوم ہے؟

﴿ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ﴾ (لقمان۔۳)

اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے تاہم اس کا علم

ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے، جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط قرار دیئے ہیں وہ پورے نہ ہوں۔

﴿ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (ہود-۱۰)

اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (حجرات)

بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

۴۔ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرہ علم سے قطعاً باہر ہیں۔ ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے' خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے' جنت و دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آسکتی۔ یہ تمام امور غیب ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ (انبیاء-۳)

جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (بقرہ-۱)

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔

﴿ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ﴾ (مریم-۴)

وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں ہے۔

''غیب میں'' کے معنی ہیں' بے جانے' بن دیکھے' حواس سے علم حاصل کئے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جاسکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں۔ بعض گذشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آموز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطے سے ان کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گذر چکا' آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں' امت محمدیہ کے انقلاب' قیامت کے مناظر اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت و حشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہیں۔ اسی طرح حال کے ان مناظر و احوال کا علم بھی عنایت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ قبروں کا انکشاف' نیں پردہ رویت' دوسروں کے سامنے موجود احوال سے واقفیت وغیرہ اس علم غیب میں سے بھی پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس و تصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں۔ خود خدا کا دیدار اور فرشتوں کی رویت' جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لئے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وحی اور ملکۂ نبوت:

علمائے اسلام نے وحی کی حقیقت "ملکۂ نبوت" کے لفظ سے ظاہر کی ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیب کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ جمادات بے حس ہیں، ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور وہ دماغی قویٰ حافظہ، تذکر اور غور و فکر کی قوت سے وہ محروم ہیں، ان سے اونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوت احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ تصور تعقل وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں' انسان میں وہ دماغی و ذہنی قویٰ ہیں جو حیوانات میں نہیں اسی طرح انبیاء میں علم و تعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے۔ وہ ذہنیات و عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے۔ اس ذریعہ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات' فطریات اور بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور انہیں کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان' فطرت قویٰ' بداہت اولیٰ' احساس اور غور و فکر سے معلومات حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے۔ شرع کی زبان میں اسی کو وحی والہام کہتے ہیں۔ علم کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو غیبی علم کہہ سکتے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے۔ یہی وحی ہے۔

امعان نظر سے معلوم ہوگا کہ اہل عقل و نقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوت آغاز پیدائش ہی میں فطرتاً ودیعت کر دی جاتی ہے اسی طرح انبیاء میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کر دی جاتی ہے یا یہ کہ وہ فطرتاً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم و فہم رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت' عقل کی نقل اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے۔ وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہ فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا ان

ی رسالت و نبوت سے متعلق ہے اور جس کو دین کہتے ہیں وہ کل استعداد اور ملکۂ فہم ہوتی ہے جس سے غیر نبی محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں۔ اسی کا نام "ملکۂ نبوت" ہے اور اہم مسائل دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو مخفی اطلاع ملتی رہتی ہے اس کا نام "وحی" ہے۔

آج کل قرآنیین اور منکرین حدیث کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ در اصل انہیں دونوں قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہ راست وحی ہے مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے مابین ہے۔ جیسے قرآنی وحی براہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام ان کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ دینی قوت علم و فہم کا نتیجہ ہے جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لئے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا منشاء "ملکۂ نبوت" کے ذریعہ وحی ربانی کی ترجمانی ہے اس لئے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاطاعت ہیں۔

کتاب اور سنت:

اس تقریر کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی متلو یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الٰہی، صحیفہ ربانی، تورات، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نور نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا علم حسی اور دوسرا معنوی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسرا فروعی ہے۔ یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مخصوص احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں۔ کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے کتاب براہ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہم نبوی کا۔ کتاب بلفظہ وحی ہے اور سنت بالمعنیٰ۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو:

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ اس تفریق کا مقصود حقیقۃً تلاوت و عدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کئے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں۔ ان کو حرف حرف اور لفظ لفظ ﴿ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں بلکہ صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لئے کتاب

کی وحی مدون، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں اس لئے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قرأت کئے جا سکتے ہیں اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ اس کو کتاب الٰہی کہا جا سکتا ہے مگر معناً اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کتب حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں۔ بنا بریں چونکہ سنت وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جا سکتی ہے لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں اس لئے وہ غیر متلو ہے۔

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے۔ قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لئے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخیر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جا سکتا ہے اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو در حقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کے فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے اس لئے صحابہ کے دریافت پر یا خود حضور ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک نکتہ اور بھی ہے کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی تشریح چاہی اور انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا اور اس لئے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت ﷺ قرآن پاک کے بعینہٖ انہیں الفاظ کو بے کم و بیش دہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کیونکہ انہیں الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب تو سوال کی نوبت آئی اس لئے ضرور تھا کہ آنحضرت ﷺ الفاظ کو بدل کر اور طریقِ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانون الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول ﷺ نے سمجھنے کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے اس لئے اصل مفہوم و منشاء کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور ملکۂ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں۔ اسی لئے ان کو اصطلاح میں "وحی غیر متلو" کہتے ہیں۔

ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب[1] ہے۔ یہ وحی الٰہی کا حقیقی منشاء ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس منشائے الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے" کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے" ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا "تیری ماں" "تیری ماں" "تیری ماں" ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے۔ صحابہؓ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے "وہ ذلیل ہوا وہ ذلیل ہوا وہ ذلیل ہوا" حاضرین نے عرض کی یارسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا "وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گذاری کر کے جنت نہ حاصل کر لی" ایک اور مجلس میں صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟ فرمایا "وقت پر نماز ادا کرنا" دریافت کیا اس کے بعد۔ فرمایا "ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا"

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں۔

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ (بقرہ۔۹، نساء۔۶)

ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو

﴿ وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ ﴾ (اسرائیل۔۳)

وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اف نہ کہو

﴿ وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ (احقاف۔۲)

یہ (ماں باپ کے خدمت گذار) وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگذر کرتے ہیں

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیانات و تشریحات کا ہے۔[2]

احادیث، قرآن کا بیان ہیں:

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق اور وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عموی اور کلی احکام کے تحت میں مندرج ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریح فرمائی ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں۔ ایک وہ جن میں آنحضرت ﷺ نے

---

[1] مجھے یہی شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر الحمد للہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہوا ہے کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے۔ چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ (ص ۲، ۳۴، ۹۲) مطبوعہ علمیہ مصر ۱۳۱۲ھ میں اور سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام جلد اول ص ۲۱ تا ۴۴ مطبوعہ سلفیہ ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

[2] کتاب الرسالہ امام شافعی صفحہ ۸۔

اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی۔ اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے؟ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی مگر خود اس حکم کے ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے ہیں جو کسی آیت کا جز ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے۔ اس صورت میں بھی اصل وفروع کی تمیز اہل فہم کے لئے آسان ہے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرمایا ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش وقت نظر کا کام ہے۔ ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز و اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پا سکتے ہیں۔

الہام واجتہاد وحکمت:

امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ میں احادیث وسنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک وہ جو بعینہ قرآن پاک میں مذکور ہیں، دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں، تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً۔ یہی تیسری قسم قابل بحث ہے۔ امام صاحب نے اس کے متعلق آئمہ سلف کے چار نظریے نقل کیے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی [حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرے]

۲۔ رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

۳۔ تمام احادیث نبوی القاء فی الروع ہیں (یعنی رسول ﷺ کے دل میں خدا نے ڈال دیئے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔

۴۔ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں کتاب الٰہی سے جداگانہ مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تینوں دراصل میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں۔ پہلے نظریہ کا منشاء یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً آپ پر آتی رہتی ہے اس کو ابتداء وحی سے ایک توفیق ازلی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کرکے فیصلہ کرتا ہے۔ تیسرے نظریہ میں اسی توفیق کو الہام، القاء فی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشاء یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط عام انسانی وبشری فہم سے نہیں ہوتا ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ ہے گا بلکہ وہ پیغمبرانہ قوت فہم کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ قوت فہم کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، اجتہاد سے کرو یا اس کو حکمت نبوی کا نتیجہ یا توفیق الٰہی کہو، بات ایک ہی ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفہ ربانی سے ماخوذ ومستنبط

ساتواں مبحث احادیث نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبوی کی اقسام

رسول اللہ ﷺ کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک تو وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور یہ آیت:

﴿مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (حشر ۱)

پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال یہ جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دار و مدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گذر چکا قوانین شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضع قانون کے مقاصد انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ ﷺ کو تعلیم کر دیا تھا۔ وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا آپ اسی کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا ان کی تشریح فرما دیا کرتے تھے۔ حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً اخلاق صالحہ و اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دار و مدار اجتہاد پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا۔ فضائل اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے۔ ان قوانین کا بیان اوپر گذر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کر کے اور اس کے معانی کو بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ "میں صرف ایک آدمی ہوں جب میں تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں"۔ اور کھجوروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ "میں نے ایک خیال قائم کیا تھا۔ میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا" اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ "تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو"۔ اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دار و مدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادتاً کیا عبادتاً نہیں، اتفاقاً کیا قصداً نہیں، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً ام زرع اور خرافہ کے قصے، وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابتؓ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اس طرح بیان کیا کہ "میں آپ کا پڑوسی تھا اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟"

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ ﷺ نے اپنے زمانہ کے جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ "اب ہم کو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے اس کو ہلاک کر دیا" یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ شاید اس کا سبب کوئی اور ہو، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی۔ اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ "جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے" نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کیونکہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ "واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا اس کے معنی بھی یہی ہیں"۔ (انتہی کلامہ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے، یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم الٰہی سے ماخوذ ہیں، دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہیں۔

۱۔ کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر چلیں تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

۲۔ وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

۳۔ وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی و ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً وضع لباس، فرش پر نشست، کمبل اوڑھنا، دسترخوان، چوکیوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

۴۔ وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا مثلاً ام زرع اور اس کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

۵۔ عربوں کے بعض تجرباتی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

۶۔ زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر کھجوروں کے پھول مادہ کھجوروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے۔ آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض ایک بات سمجھ کر فرمایا کہ "اگر ایسا نہ کرو تو کیا ہو۔" مدینہ والوں نے آپ کے اس جملے سے اشارۂ حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہو گئی۔ لوگوں نے آ کر عرض کی۔ فرمایا "میں نے ایسا خیال کیا تھا، انتم اعلم بامور دنیاکم، کہ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو" یہ اسی تغیر اور ردوبدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے دوسرے امور جن کا تعلق دین اور رسالت و نبوت سے ہے مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں۔ ایک براہ راست وحی الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہاد نبوی یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے۔ شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں:-

۱۔ ایک یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے۔ مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول و قواعد کا علم منصب نبوت کے ساتھ عطا فرما دیا ہے۔ اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کلی کے جزئیات مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے۔

۲۔ پیغمبروں کا یہ اجتہاد دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا و غلطی سے بالکل پاک و منزہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے خطا و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے اس لئے "ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلۂ وحی کے ہے"

"پیغمبرانہ اجتہاد" کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القاء، تفہیم ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور "اجتہاد نبوی" میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبوتیہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے اس لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں۔ مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیاء آئے ان کی وحی کتاب اور ان کی حکمت نبوی میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہا۔ چنانچہ تورات اور انجیل و زبور میں یہ سب باہم ملی جلی ہیں جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تحریف اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴾ (شعراء-۱۱)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ ان پر اترتے ہیں جو جھوٹ گھڑتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔ لوگوں کو یہ شیطان دل نے کے لئے کہ غیب کی باتیں سنی ہیں کان ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا۔

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ (جاثیہ-۱)

پھٹکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار ہے خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑا ہی رہتا ہے گویا کہ اس نے سنا نہیں تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت سنا دو۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین اور ملتقی ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے اور یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گنہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ ﴾ (آل عمران-۸)

اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے یہ شایاں نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشاء خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنے بندہ اور پرستار بنانا اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔

اور ایک آیت میں فرمایا۔

﴿ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ ۚ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَن بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾ (آل عمران-۱۷)

کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ کچھ چوری سے چھپائے اور جو کوئی چھپائے گا قیامت کے دن اسے کر اس کو حاضر ہوگا پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے وہ اس کے جیسا ہو سکتا ہے جو خدا کا غضب کما کے لایا اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ان انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے۔ بے شبہ خدا نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں

ایک ایسے رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ بے شبہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے کیونکہ اللہ کی رضا مندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سناتا ہے خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انبیاء علیہم السلام کے لئے بار بار قرآن نے "چن کر پسند کرنا" کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے۔

﴿ اللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾ (حج - ۱۰)

خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر کو چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں سے

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (آل عمران - ۴)

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا پر چن کر پسند کیا۔

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا۔

﴿ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ﴾ (بقرہ ۱)

ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔

حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا:

﴿ اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ﴾ (اعراف - ۱۷)

میں نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں پر چن کر پسند کیا۔

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے مصطفٰے کے ساتھ اخیار (بہتر اور نیکوکار) کی صفت کی ظاہر کی گئی ہے۔

﴿ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴾ (ص - ۴)

ہمارے خاص بندوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو ہاتھوں والے (قوت عمل) اور آنکھوں والے (قوت علم) تھے۔ ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرے کے بعد فرمایا:

﴿ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ

وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴾ (انبیاء-۵)

ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے نیک پرستار بنائے گئے۔

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا

﴿ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [انعام-۱۰]

یہ سب صالحوں میں تھے۔

پھر آگے چل کر فرمایا۔

﴿ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [انعام-۱۰]

ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔

پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا۔

﴿ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

"اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا"

صالح ہونا برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی و سعید اور گنہگار و نیکوکار دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس و اشتباہ ممکن نہیں۔ تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں۔ اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ (جاثیہ-۲)

کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح بنا دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یعنی ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیاءؑ کے وصف میں فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ﴾ (احزاب-۵)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

آنحضرت ﷺ کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے۔ ازواج مطہراتؓ کی شان میں ہے۔

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ﴾ (احزاب-۴)
اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہو اگر تم متقی ہو۔

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف ستھرا بنائے۔

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (احزاب-۴)
خدا یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کرے، اے نبی کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنائے۔

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کے لئے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیاء علیہم السلام کا کیا ذکر ہے۔ ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ﴾ (نور-۳)
گندیاں گندوں کے واسطے اور گندے گندیوں کے لئے اور ستھریاں ستھروں کے واسطے اور ستھرے ستھریوں کے واسطے، یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔

یہاں طیب (پاک اور ستھرے) سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے پن، پاکی اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی ستھرا پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیاء درحقیقت مقتدیٰ اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (احزاب-۳)
تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔

پھر ان کی اطاعت واجب ہے۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (نساء-۹)
ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اور خاص آنحضرت ﷺ کی نسبت تصریح ہے کہ آپ کی پیروی خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران-۴)
"اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم کو چاہے گا۔"

کیا کسی گنہگار اور عصیاں کار کی زندگی پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تاریکی سے کبھی روشنی نکلی اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گنہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے؟ برائی اور گنہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوت شر ہے لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دام فریب سے آزاد ہیں۔

﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا﴾ (اسرائیل-۷)
یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں چلے گا، تیرا پروردگار اپنے بندوں کی طرف سے سب کچھ کرنے کو بس ہے۔

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے؟

بعض شبہات کا ازالہ:

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر بے معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی نے شفا (قسم ثالث باب اول) میں خفاجی نے شرح شفا (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں نواب دوست محمد کابلی نے تحفۃ الاصفیاء فی عصمۃ الانبیاء میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے۔ مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں پیش آتی ہیں ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دینا ہے۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو اور ان کا دامن گناہ و عصیاں کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی سی ہے اور ایک عبد و غلام خواہ کسی قدر طاعت کیش، کتنا ہی وفا شعار اور مطیع و فرمانبردار ہو تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا معترف، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگذاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ جن کی خلت اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے وہ خدا کی عظمت و جلال اور اس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ﴾ (شعراء ۵)

اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی بڑی امید رکھتا ہوں۔

نبی کا یہ اعتراف و اقرار، تقصیر و ندامت اس کا نقص نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچے ہیں وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے۔ بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گذشتہ رتبہ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے تا کہ وہ اس کے مزید تقرب کا ذریعہ بن سکے۔ آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوتا ہے:

﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ﴾ (نصر)

جب اللہ کی مدد آ چکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندوں کے حال پر رجوع کرنے والا ہے۔

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی

معافی چاہیے۔ اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا o لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ وَیَھْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا o وَّیَنْصُرَکَ اللّٰہُ نَصْرًا عَزِیْزًا﴾ (فتح۔۱)

ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی' تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے' اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے' اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰؑ جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی' اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہل عرب قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے' ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُھُمْ اِلَیْہِ جَمِیْعًا﴾ (نساء۔۲۳)

مسیح کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو' اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے

الغرض انبیاءؑ کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف' ان کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا اس کی گنہگاری کا اعلان نہیں بلکہ اپنی پسندیدگی رضا اور قبول تام کی بشارت ہے۔ سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گذریں ان کو پڑھو تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی اس لئے جب وہ پیغمبرؑ اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جان فروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلہ احسانات کی تکمیل ہوئی پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی۔ کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی' یہ سب مرتبے حاصل تھے' مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگذاشتوں پر (اگر ہوں) خط عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعت فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت فرمائے۔

عبدیت کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ میں نمایاں ہے۔ ایک سردار ان کو "اے نیک استاد" کہہ کر خطاب کرتا ہے' اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں۔

"تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا" (لوقا ۱۸۔۱۹)

حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے کس قدر غلط ہوگا' اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا

اپنی مشہور دعا میں یہ کہا کہ

اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں تو اپنا دین ہم کو بخش دے (متی ۶۔۱۲)

ان کی گنہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیت کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ:

عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ۔ ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد و جان بوجھ کر کیا جائے لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط عمل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا ان جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر بھول چوک سے ہو یا قصداً اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو در حقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں لیکن انبیاء کے حق میں ان کی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں)

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ "ذنب" کا لفظ استعمال ہوا ہے جرم، اثم یا حنث کا نہیں۔ ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل ہے[1] اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفارِ ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فرو گذاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم و لطف عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے

اس سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابل مواخذہ نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبے کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و عمل شریعت بن جاتا ہے اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و عمل کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اسی بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چوک معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ و نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے۔

﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾ (بقرہ۔۴)

تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا

﴿ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾ (طٰہٰ۔۷)

---

[1] اس فرق کو ہم الفاظ کی بحث سے ... نہیں ہے مگر بعض علمائے لغت نے الفاظ کے فرق پر کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اسی فرق کی تصریح کی ہے۔ ہم یہاں پر چوتھی صدی کے مشہور ... ابو ہلال ... کی کتاب الفروق اللغویہ کی عبارت نقل کرتے ہیں: [illegible] (صفحہ ۲۳۶۔۲۳۷ مطبوعہ [illegible])

پھر خدا نے آدم کو برگزیدہ کیا پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔

﴿لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ﴾ [توبہ-۱۴]

بیشک اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ﴾ [انبیاء-۶]

پھر ہم نے یونس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے نجات دی۔

﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾ [فتح-۱]

تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی سب فروگذاشت معاف کرے۔

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبہ خود بندہ کی زندگی میں انبیاء کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

۲۔ انبیاء کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیاء کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت اضافی الفاظ ہیں۔ علم کے بڑے سے بڑے درجہ کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند درجہ کو اس سے اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے۔ جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا شاخیں پتے پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک تناور درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشام جان کو معطر کرتے ہیں، اس کے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی ظہور نبوت کے بعد تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے جس طرح عام افرادی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے اسی طرح انبیاءؑ کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاءؑ کے حق میں مستعمل ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت ﷺ پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے۔

﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ﴾ [ضحیٰ-۱]

کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا پھر ٹھکانا دیا اور اس نے تجھ کو بے راہ پایا تو راہ دکھائی اور تجھ کو تنگ دست پایا تو بے نیاز کیا۔

مذکورۂ بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

ضلالت کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں بلکہ نادانستہ بھولنے بھٹکنے اور غفلت کرنے کے بھی

ہیں۔ عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے۔

﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰھُمَا الْاُخْرٰى ﴾ (بقرہ۔۲۸۲)

کہ بھول جائے ایک عورت تو یاد دلادے اس کو دوسری۔

ایک روایت میں علم الٰہی کی تعریف میں ہے۔

﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسٰى ﴾ (طہ۔۵۲)

نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ "ضلال" کے معنی عربی میں اور خود قرآن میں صرف گمراہی کے نہیں بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی کو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن خود ہدایت الٰہی کا نور اس کے سامنے تیز نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے مگر اس غلطی کی ٹھیک ٹھیک صحت نظر نہیں آتی، جہل کی برائی تو معلوم ہوتی ہے مگر خود علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے، یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقاً مر گیا تھا۔ نبوت پا کر جب واپس آئے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے قدیمی مجرم ہو۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔

﴿ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾ (شعراء۔۲)

میں نے اس حالت میں کیا تھا کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔

اس چوک اور ضلالت سے مقصود صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی ہدایت سے سرفراز نہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی وہ صرف یہ تھا کہ فرعون کو جو بے جا ظلم کر رہا تھا کوئی اور ضرب کیا تھا۔ کسی کے حمایت میں گھونسا مارنے سے اتفاقیہ کسی تندرست کا مر جانا مارنے والے کا بالقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے ماقبل زندگی ہے۔ اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے جیسے یہاں "ضلالت" کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ اس کو "غفلت" (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے۔

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ڰ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ (یوسف۔۱)

ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔

اس بے خبری کے مطلب کی تفسیر دوسری آیت میں ہے جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر کر دیا ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (شوریٰ۔۵)

اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے؟ اور نہ ایمان' لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے ہیں' اپنے بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں اور بے شبہ تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

"کتاب وایمان" کے نور وہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت حالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا ہے۔ اس سے مقصود حقیقی گنہگار' عصیاں کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے بلکہ طلب حق' تلاش' معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے۔ آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے' روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے۔ یہ ہدایت کا دور ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر انبیاءؑ کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے۔

﴿ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ﴾ (انعام۔۱۰)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوحؑ کو ہدایت دی۔

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد "ضلالت" ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبہ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری' عصیاں کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدم نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت اور رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت:

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کی مخلوق' خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے' وہ خدا' خدا کا اوتار' دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے افراط وتفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی۔ اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے اور وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے' وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم وہ پیغمبر سمجھے جاتے تھے دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے "نجات دہندہ" کو انسانیت سے پاک' خود خدا یا خدا کا جزء یا ناسوت ولاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے' اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی' وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض' صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ' معصوم' نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں' سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب وغریب امور صادر کرنے والا مانتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں' علانیہ تردید کرتا ہے۔ اہل عرب بھی ہندوؤں' یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی

چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا اور انسانوں میں فرشتہ بھی آتا تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو اس حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے؟

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، دوسری طرف روحانی روحانیت، بے گناہی، پاکدامنی اور اخلاص میں نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر مافوق البشر ہوتے ہیں۔ یہی مغالطہ تھا جو اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا۔ پیغمبر ان کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو؟ چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

﴿ أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ (اسرائیل۔ ۱۱)

کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔

وہ بشریت اور رسالت کو منافی سمجھتے تھے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

﴿ هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ (اسرائیل۔ ۱۰)

میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔

ان کو شبہ تھا کہ کیا کوئی انسان انسانوں کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

﴿ أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا ﴾ (تغابن۔ ۱)

کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟

یہی شبہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰ کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دلا سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان موروثی گنہگار نہیں بلکہ وہ گنہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں۔ یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی اور دنیا کو ظاہری اور مادی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے۔

﴿ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (ابراہیم۔ ۱۲)

تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ:

﴿ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (انبیاء۔ ۱)

نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

﴿ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (مومنون۔۲)

نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

انبیاء کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے۔

﴿ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (شعراء۔۸)

تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

﴿ مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (یٰسین۔۲)

تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو بداہت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے۔

﴿ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا ﴾ (ہود۔۳)

ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام نے بیشک یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے فرمایا

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾ (ابراہیم۔۲)

ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی۔ انبیاء نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ "کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں"۔ اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا جو انبیاء کی شان الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ سمجھا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں۔ گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصب نبوت کا امتیاز پاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا اس کے

علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف موکلات اور اتفاقی امور ہیں جن کی پیروی کرنا اسلامی شریعت کی اطاعت اور اسلام کا جز ہے۔ یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہئے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کرکے قصور معاف کرا دیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

﴿ أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ﴾ [کہف۔۱۲]

کیا وہ جنھوں نے کفر کیا یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں رسول اور فرشتوں کو میرے سوا اپنا حامی بنائیں گے۔ ہم نے ان کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے۔

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے۔ یہ رکوع کا شروع ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے پھر ارشاد ہے۔

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ (کہف۔۱۱)

کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے۔

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ﴾ (حم سجدہ۔۱)

کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لئے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا کے دوسرے بندے۔ دعائیں خدا ہی سے مانگی جائیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہئے۔ یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اور ان کے اس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا حضرت عیسیٰ کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے۔ چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت ﷺ سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے سامنے سونے کی چھت بنوالو اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو۔

﴿ وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ﴾ (بنی اسرائیل - ۱۰)

اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے جب تک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جس میں تم نہریں بہا دو یا جیسا تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو یا خدا کو اور فرشتوں کو سامنے لا کر نہ کھڑا کر دو یا تمہارے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم اس وقت تک یقین نہ لائیں گے جب تک تم وہاں سے ایک نوشتہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔

یہ امور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازیگرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس غلط عقیدہ کو ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرما دیں۔

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَن قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا ۝ قُل لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا ﴾ (اسراء ۱۰)

کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں رسول اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر اتارتے۔

آنحضرت ﷺ سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے، قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا۔

﴿ هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ﴾ (انبیاء)

یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی انہیں کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں جن کو تم سے پہلے سے آسمانی کتابیں عطا ہوئی ہیں یعنی یہود ان سے پوچھ لو کہ رسول ہمیشہ بشر ہی ہوتے ہیں۔

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ ۖ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴾ (انبیاء)

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جن کو ہم وحی کیا کرتے تھے۔ جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا۔

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ﴾ (یوسف)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے جن پر وحی کرتے تھے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے۔

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴾ (نحل)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے مگر انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اتاری گئی اور تاکہ وہ سوچیں۔

ہر شخص جو منطقیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ بھی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی حیثیت اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور طاقت سے ہے ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، ذہنی، علمی اور عملی حیثیت سے وہ انسان ہو کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور بالاتر ممتاز ہوتا ہے۔ نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے اس فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی اتفاقیہ دیانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے اگر کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے اور دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علاوہ علم و جہل کے طفیل ممتاز متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں حالانکہ ان میں علم و جہل کا فرق کہہ کر در حقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرتا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق ماننے والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا۔ وحی و رسالت کو چھوڑ دو دوسرے انسانی کمالات کو مثلاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا۔ انسان کے لئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی پہلوان رستم انسان نہ تھا۔ علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور باایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں ہر ایک چیز میں ویسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں جیسے دوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان۔ یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی ہے۔ وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی

اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صرف یا لگ بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں ﴿ ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی و یسقینی ﴾ [1] "تم میں کون میری مثل ہے؟ میں رات گذارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے" کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور دل کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مشیت کی اس میں نفی نہیں ہے؟

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے آپ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا ﴿ وکذلک الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم ﴾ [2] اور اسی طرح انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔ کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت ﷺ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں "کہ میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے" کیا عام انسانوں کی قوت بصارت کا بھی یہ عالم ہوتا ہے؟ قرآن پاک میں ہے ﴿ افتمرونہ علی ما یری ﴾ "کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو؟" ﴿ ولقد راٰہ بالافق المبین ﴾ "اور اس نے فرشتہ کو آسمانوں کے کناروں میں دیکھا" کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں آنحضرت ﷺ کے انتساب سے امہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا اس کا اقتضاء یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا ﴿ ینساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن ﴾ (احزاب۔۴) "اے پیغمبر کی بیویو! تم اگر تقویٰ ہو تمہاری حرمت اگر خدا کا ڈر رکھو" تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ لست کاحد من البشر کا مخاطب نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی ورسالت کے تمام لوازم خصوصیت اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے اس لئے کسی انسان کو صاحب وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضروری ماننا پڑے گا۔

اجتہاد نبوی میں خطا:

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت ﷺ کو آپ کی چند فروگذاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ بعض امور میں آپ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے

1. صحیح بخاری کتاب الصوم۔
2. صحیح بخاری باب المعراج۔

اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے بھی کوئی تنبیہ نہ ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہاد نبوی کے فیصلوں کی صحت و غلطی کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی مگر واقعات دونوں کے خلاف ہیں۔ صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد نبوی میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں۔ ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا، ان پر عمل کیا اور وحی الٰہی نے ان پر خاموشی برتی تو منشائے الٰہی نے گویا ان کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے۔ ان پورے تئیس سالوں میں ہزاروں واقعات اور صورتیں پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کئے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں نکلی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق محض دینی شریعت یعنی اعتقادات، عبادات یا شرعی معاملات میں سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا وقتی ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین و شریعت میں آپ کے پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا اور غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی:

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں، یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقراء تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علت مشترکہ کی صحیح تعیین معلوم نہیں ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہاد نبوی میں نہیں ہیں کیونکہ اجتہاد نبوی ان طریقوں پر مبنی نہیں ہوتا اور نہ وہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقراء و تمثیل کے منطقی و اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نور رسالت، علم نبوت، حکمت ربانی اور شرح صدر پر مبنی یا قائم ہوتا ہے جن میں یہ نقائص کی صورتیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں، اسی لئے لفظ اجتہاد جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا دینی یا اخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے۔

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی:

جن اجتہادی امور پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے ان میں

۱۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت سے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت ﷺ اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے سردار آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھے۔ آپ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے، بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب و نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتوم بھی آ کر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا۔ قریش کے یہ سردار بے حد مغرور اور خود پسند تھے۔ وہ آپ کے جلسوں میں صرف اس لئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں غریب و بے حیثیت اور ادنیٰ درجے کے لوگ آیا کرتے ہیں۔ اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے عبداللہ بن ام مکتوم کا آنا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبے کا اشتعال ہوا اور راستے سے بدک گئے۔

عبداللہ بن ام مکتوم کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں، اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں ہرج نہیں، لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگان مکہ پر اثر انداز ہو گی۔ اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی۔ یہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سراپا متوجہ رہے۔ اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی۔

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ۝ وَهُوَ يَخْشٰی ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ۝ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ﴾ (عبس)

تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا کہ اس کے پاس اندھا آیا، اور تجھے کیا خبر شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو (تمہارا) سمجھانا کام آتا۔ وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی الزام نہیں، اور جو تیرے پاس دوڑتا آیا اور وہ (خدا) سے ڈرتا ہے تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس اجتہاد پر کہ ایک نابینا لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب، آقا و غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں۔ اس کی نگاہ میں چھوٹا اور بڑا دونوں برابر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت کے فیصلہ میں آپ کے پیش نظر یہ تھا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر

کیا اثر پڑے گا اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا پیغام دنیا کے لئے صدائے عام ہے۔ جو چاہے قبول کرے اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے اس لئے ان کی طرف حریصانہ توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے عمل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ:

سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت کو حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زرِ فدیہ قبول کرنے کا ہے۔ اس وقت تک ظاہر ہے کہ مال غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا مسلمانوں کو مدینہ منورہ آ کر سب سے پہلے سریہ نخلہ میں مال غنیمت ہاتھ آیا اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مال غنیمت ملا اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرفاء تھے۔ ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں۔ بعض ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے جس سے ان کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے۔ نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے وہ بے کسی، مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی و مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ، قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشہ میں مدہوش و سرشار نہ ہونا اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے یہ بڑا ہی مشکل کام ہے جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے، اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے، اور اس وقت رد عمل یا انتقام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ پیدا کرے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ عیسائیوں نے رومیوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتاً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے تو عیسوی قوم کا پچھلا صبر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے اس نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاق انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوۂ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا۔ غریب و تنگدست مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسب معاش سے محروم اور غیر معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغدار تھے وہ دفعتاً مغلوب ہو گئے ان کے بڑے بڑے سردار ان کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے اور ان کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی، یکجہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور وہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفریق اور حرص و طمع اور ہوائی اغراض

کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابہ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع
پیش کر دیا جو دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوت رہنمائی کے اظہار کا بھی موقع تھا۔ چنانچہ اس وقت مال غنیمت، زر
فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلاف رائے رونما ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کے
سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا۔ آپ نے امر اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر ظالم نہ بن بیٹھیں۔
چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ نے رد فرما دی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی
تجویز کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ "اے ابوبکر تمہاری مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی ہے
اور اے عمر تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے۔"[1] آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰؑ کی رحم دلی کی
مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کی بجائے زر فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا،
اور جو ان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے پر آزادی کا فرمان جاری کر دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ
ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں۔ چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو
روٹی کھلاتے تھے۔[2]

لیکن وحی الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبوں کا دل تھا جو مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو رہا تھا
چنانچہ یہ صورت پیش آئی۔ مال غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس
لئے ہمارا ہے۔ لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی
حقدار ہم ہیں۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا
اس لئے ہم کو ملنا چاہئے۔ یہی اختلاف زر فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے
ظاہر ہوتا ہے۔

﴿ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ ۖ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۖ
وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴾ (انفال ۱)

(اے پیغمبر!) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو
اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے؟ تو کہا

﴿ فینا اصحاب بدر نزلت حین اختلفنا فی النفل وساءت فیہ اخلاقنا فنزعہ اللہ من
ایدینا فجعلہ اللہ الی رسول اللہ ﷺ فقسمہ رسول اللہ ﷺ بین المسلمین عن سواء ﴾

یہ سورۂ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق
برے ہو گئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا تو آپ نے

---

1. مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱ کتاب المغازی حیدر آباد دکن۔
2. سیرت ابن ہشام ذکر اساری بدر [illegible]

تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرما دیا۔

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ پر کی اور یہ آیت اتری۔۔۔

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (انفال)

کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں تا آنکہ زمین میں قتال نہ کر لے، تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے۔ اگر خدا کی طرف سے پہلے ہی سے مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا حلال و پاک کر کے کھاؤ اور اللہ کا ادب کرو، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زر فدیہ وصول ہو یا وصول کیا جا رہا تھا اس کے بعد ہی تسلی دی گئی۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (انفال)

اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں بھلائی پائے گا تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کر دے گا اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے بدلے زر فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کئے جانے پر ہوئی ہے۔[1] حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زر فدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کریں تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی نقصان پر جو ان سے بطور فدیہ لیا گیا ان کو بہتر دولت دیئے جانے کی امید دلائی گیا ان کا قتل زر فدیہ لینے سے کم مرغوب ہوتا؟ اور جن سے بطور فدیہ لیا گیا ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی ظاہر کی جاتی۔

بہرحال وہی مال غنیمت اور زر فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت ﷺ نے صاف و صریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرمایا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی وہ آخر کار اجتہاد نبوی کے مطابق مناسب موقع پر جائز و حلال و طیب ہی ٹھہرایا گیا اور غلطی باقی نہیں رہی۔ مال غنیمت لینے سے متعلق ﴿فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ﴾ کا حکم اسی وقت آ گیا اور فدیہ لینے کی اجازت ﴿فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً﴾ (قتال) میں بعد کو حسب ضرورت آ گئی اور اس میں دولت کی حرص و طمع سے اس وقت جو بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا گیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا اور اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیے گئے۔[2]

---

1. سیرت ابن ہشام ج ۱ ص [illegible]
2. مزید تفصیل کے لئے دیکھو سیرت النبی جلد اول میں غزوہ بدر کا بیان۔

تیسرا واقعہ:

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے جا رہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کے ٹڈی دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر کھانے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا۔ تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہوئی مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا۔ آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصور وار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے۔ آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگذر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی۔

﴿وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ﴾

(توبہ۔۶)

وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے، وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو ان میں سچے ہیں اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔

ظاہر ہے کہ آپ عالم الغیب نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بظاہر ان کے قول پر اعتبار کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا، مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا۔ بہرحال یہاں بھی منشائے خطا اگر خطا کہی جائے تو وفور رحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ:

منافقین کی نسبت آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی اور فرما دیا گیا تھا کہ:

﴿اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (توبہ۔۱۰)

تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے، اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا، یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا۔ اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا۔ اس نے آ کر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی جس کو آپ نے فرط کرم سے رد نہ فرما سکے۔ حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی یا رسول اللہ! اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے۔ فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا، بہرحال آیت بالا میں کہ آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو یکساں قرار دے کر بے سود بتایا

آپ کو اور بھی ایسے معاملات پیش آئے ہوں جن کی صحیح تصحیح کی حکمت الٰہی نے پروا نہ کی اور خاموشی برتی۔ اگر کسی کو یہ شبہ ہو تو در حقیقت رسالت و نبوت کی مرتبہ شناسی اور دین الٰہی و شریعت ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے عرفان رشد و ہدایت کی مصلحت سے کوسوں دور ہے۔ رسولوں کی بعثت اسی لئے ہے کہ وہ غلط کار انسانوں کو ان کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں تو اس لئے کیسے ممکن ہے کہ ان کے ذریعہ آئے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ، اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام یا حکم صادر ہو جو حکمت الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر وہ اس کی تصحیح اور درستی سے تغافل برتے اور انسانوں کو خود اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

تعبیرات اجتہاد و رائے علم کا وہ نور ہے جس کی شعاعیں وحی ہی سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بھی نکلتی ہیں جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہام و القائے ربانی، حکمت یزدانی، فہم رسالت، بلکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرم اسرار شریعت عمر فاروق برسر منبر یہ فرماتے ہیں۔

﴿يا ايها الناس ان الرأي انما كان من رسول الله ﷺ مصيبا لان الله كان يريه و انما هو منا الظن و التكلف﴾ (ابوداؤد، کتاب الاقضیہ)

اے لوگو! آنحضرت ﷺ کی رائے غلطی سے پاک تھی کیونکہ خدا تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے محض گمان اور تکلف ہے۔

وہ رائے نبوی جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوتی ہو ظاہر ہے کہ بجز وحی کے ہے؟ اور اس کا نام مجرد اجتہاد اور انسانی رائے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلام ربانی کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے در حقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا﴾ (نساء)

ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو خدا تجھ کو دکھائے فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغا بازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جو دکھایا، سمجھایا اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿انما اقضی بینکم برأيی فیما لم ینزل علیّ﴾ (ابوداؤد، کتاب الاقضیہ)

میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دستگیری کرتی اور صحیح راستے پر لے آتی، جیسا کہ گذشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال:

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو "ارائت الٰہی" ہوتی تھی یعنی خدا کی

طرف سے آپ کو رائے بھی نہ دی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ ارادت الٰہی (خدا کی طرف سے سمجھایا جانا) تاکہ آپ کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس مقدمہ سے فرمایا:

''میں ایک بشر ہوں، تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے کوئی زیادہ زبان آور ہو، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں تو میں اگر کسی کو اس کے حق دلا دوں جو اس کا نہیں بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' (کتاب الاقضیہ)

اس سے ایک غلط فہمی پر استدلال بھی کر سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے بعض غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے اس لئے امت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں۔ لیکن ایسا خیال کرنا سر تا سر مغالطہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعوی کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے، جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے۔ یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعوی کسی نبی کو نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ دعوی بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا حق نہیں قرار پا سکتا۔ اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں۔ تو آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق ہمیشہ آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت ﷺ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی غیر صحیح و صواب اور عدل سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین و تحقیر ہے اور اس ''ارادت الٰہی'' کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط، مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ سمجھنے میں۔ لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمایا اس کے مطابق مناسب و صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی اور امت آپ کی پیروی آپ کے ان قضایا و فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ زمانہ مذکور کے گذشتہ واقعات اور گذشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں ﴿فتدبّر فیہا﴾

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان کی غرض یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا، سر تا پا باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کرے یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا لیکن اب جب عدالت نبوی نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہو گئی اور غصب حق کے گناہ سے بری ہو گیا تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا تاہم حکم نافذ ہو جائے گا مگر عند اللہ جو برحق تھا وہ حق پر رہے گا اور جو سر تا پا باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا۔ اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ (ابو داؤد کتاب الاقضیہ)

آنحضرت ﷺ روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان

کی اطاعت سے انحراف کفر و نفاق تھا اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (نساء۔۹)

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پائیں اور مان کر قبول کریں۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (احزاب۔۵)

اور کسی ایماندار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر نہ چلا وہ صریح گمراہ ہوا۔

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم کسی باطل پہلو پر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ بھی ظالمانہ اور ناروا نہیں ہو سکتا۔

﴿وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (نور۔۶)

اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے چلے آتے ہیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا بلکہ وہی بے انصاف ہیں۔

عقل بشری:

اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکہ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں اس کی عقل وہی ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی و الہام اور ملکہ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع بھی دوسروں پر واجب نہیں اور اس کی بہترین مثال کھجوروں کی کاشت کا واقعہ ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گذرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ایک ہمراہی نے کہا کہ "یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں۔" فرمایا "میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔" ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر ایسا نہ کریں تو بہتر ہوگا۔" اس نے جا کر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا۔ صحابہ نے جو سراپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ پھل اس سال کم آئے یا کم ٹھہرے۔ آپ کا پھر گذر ہوا تو ان

لوگوں نے صورت حال عرض کی۔ آپ نے فرمایا میں نے تو یونہی ایک بات جی سے کہہ دی تھی اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا تھا تو وہ کریں پھر فرمایا۔

﴿إنما أنا بشر إذا أمرتكم بشيء من دينكم فخذوا به وإذا أمرتكم بشيء من رأيي فإنما أنا بشر﴾

میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہیں دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ [1]

﴿أنتم أعلم بأمر دنياكم﴾

تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو۔

تیسری روایت کے الفاظ ہیں۔

﴿فإني إنما ظننت ظنا فلا تؤاخذوني بالظن ولكن إذا حدثتكم عن الله شيئا فخذوا به فإني لن أكذب على الله عز وجل﴾

میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان)، رائے اور امر دنیا سے تعبیر فرمایا ہے۔ ان سے یہ صاف سمجھ آتا ہے کہ امور دین و شریعت میں آپ کا ہر حکم واجب الاذعان واجب العمل ہے لیکن محض کاشتکاری، زراعت، علاج معالجہ وغیرہ خالص دنیوی امور ہیں، اگر آپ نے کچھ کہا تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام نے جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے، پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے۔ آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرماتے۔ غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا۔ ایک صحابی نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے۔ فرمایا محض رائے ہے تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں فلاں مقام بہتر ہے۔ آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا۔ اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہؓ سے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور ﷺ کو ﴿وشاورهم في الأمر﴾ (آل عمران) (اور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے) کا حکم خدا کی طرف سے ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا۔ لیکن امور جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقل بشری سے نہیں بلکہ وحی الٰہی یا فہم نبوی سے ہوا تھا، اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا۔ صلح حدیبیہ کی شرائط اور واقعات تمام تر مصلحت الٰہی اور حکمت ربانی پر مبنی

---

۱ یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ ﷺ من معایش الدنیا علی سبیل الرای ج ۲ ص ۲۶۴
[illegible]

تھے ان کے بدلے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ نے کیا کیا نہ زور نہیں لگایا، مگر آنحضرت ﷺ نے کچھ التفات نہ فرمایا اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ یہ نبوت سراسر صحیح تھی۔ اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ چھوڑ جانا گوارا کیا، مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحت الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتاتا ہے کہ دنیا میں ہر صاحب فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں۔ ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم و تربیت، مشق اور کثرت عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے۔ لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے۔ ایک شخص جو فن تعمیر کی مہارت اور حد سے زیادہ انجینئرنگ کی دانائی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے بالکل ممکن ہے کہ کھیتی کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو۔ ایک فلسفی جو اپنے زور فکر سے افلاطون وارسطو کی غلطیاں نکالتا ہے وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے بھی زیادہ کم عقل ہو۔ یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں۔ اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار، معرفت ربانی کے حقائق، تزکیہ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ دان عقل رکھتا ہو، اس کا تعمیر و کاشتکاری کے مسائل میں عقل معمولی درک ہو یا بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام امور دین و شریعت میں وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ، سامان و اسلحۂ جنگ، سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کا مصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا۔ پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں۔ پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے ستر عورت نہ ہو، دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو۔ کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں۔ نظم و نسق اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے: شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو، لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہل حل و عقد کا باہمی مشورہ ہو، وعلیٰ ہذا القیاس۔

غرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے اس لئے ان کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دینا مصلحت الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت:

گذشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ میں علم و فہم کے تین ذریعے ہیں۔ وحی، ملکۂ نبوت اور عام عقل بشری۔ ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ صفت سے ہی

اور دوسرے اوپر کی تصریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں، لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علماء نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں مگر مفہوم حقیقی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں۔ سلف وصالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الروع (ان فی روعی) نبی کی حکمت قلبیہ، توفیق ازلی اور قوت یقین سے تعبیر کیا ہے [1] امام غزالی وامام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو "تفہیم اور قوت اجتہاد" کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے مگر ان سب کے معنی قریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے عام دماغ اور عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح، اسرار شریعت کا بیان اور دقائق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھئے جن کا تذکرہ قرآن نے جابجا کیا ہے تو وحی کی تخصیص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ "علم نبوت" ہے جس کو کہیں ذکر (یادداشت)، کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ)، کہیں حکمت (دانائی)، کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا)، کہیں تفہیم (سمجھا دینا)، کہیں تعلیم (سکھا دینا)، کہیں ہدایت (دکھا دینا سمجھا دینا) کہا گیا ہے۔ ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے؟ ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لئے نہیں کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو بخشی گئی ہے۔ اس بناء پر اس سے مراد عقل نبوی اور حکمت نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت:

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے۔ آل ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر ان الفاظ میں فرماتا ہے:

(۱) ﴿فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا﴾ (نساء)

تو بے شبہ ہم نے ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت لقمان کی نسبت ہے۔

(۲) ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ﴾ (لقمان۔۲)

اور بے شبہ ہم نے لقمان کو حکمت دی۔

حضرت داؤدؑ کی شان میں ہے۔

(۳) ﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (ص۔۲)

اور ہم نے داؤدؑ کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا۔

---

[1] یہ تمام بحث امام شافعیؒ کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہے۔

(۴) ﴿ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ﴾ (بقرہ)

اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے اس میں سے کچھ سکھایا۔

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں۔

(۵) ﴿ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ﴾ (زخرف)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ پر اپنا احسان جتاتا ہے تو فرماتا ہے۔

(۶) ﴿ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴾ (مائدہ)

اور یاد کر جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔

عام انبیاء کے متعلق ہے۔

(۷) ﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ﴾ (آل عمران)

اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور کوئی حکمت دوں۔

حضرت ابراہیمؑ نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی یہ دعا کی تھی۔

(۸) ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (بقرہ)

ہمارے پروردگار! ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔

(۹) ﴿ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴾ (بقرہ)

جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت ﷺ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں بھی ظاہر فرمایا ہے۔

(۱۰) ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴾ (آل عمران)

یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان انہی الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہرایا ہے۔

(۱۱) ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ (جمعہ)

وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

خود آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے۔

(۱۲) ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (نساء۔۱۱۳)

اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

آنحضرت ﷺ سے خطاب ہے۔

(۱۳) ﴿ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (اسرائیل)

یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

(۱۴) ﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ﴾ (بقرہ)

اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے اس کو یاد کرو، خدا تم کو اس سے سمجھاتا ہے۔

خاص طور سے ازواج مطہرات کو خطاب ہے۔

(۱۵) ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ (احزاب۔۴)

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو

یہ حکمت حسب استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے۔

(۱۶) ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ (بقرہ۔۳۷)

اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت سکھاتا ہے اور جس کو حکمت بخشی گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے۔

(۱۷) ﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (نحل۔۱۲۵)

"اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف" تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا، اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر۔

ایک جگہ قصص اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے۔

[۱۸] ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ﴾ [قمر۔۱]

اور ان کو اتنے احوال پہنچے جن میں ڈانٹ ہو سکتی ہے، پہنچی ہوئی ہیں پوری حکمت، لیکن ڈرانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکے۔

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئی ہیں جن میں حکمت کا لفظ آتا ہے۔ ان آیتوں میں حکمت کا لفظ کہیں تنہا آیا ہے اور کہیں "کتاب" کے بعد آیا ہے۔ کتاب کے دو معنی قرآن میں آئے ہیں، ایک "صحیفہ ربانی" کے معنی میں اور یہ کثرت آیا ہے اور دوسرے نوشتۂ الٰہی اور علم الٰہی کے معنی میں جیسے ﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ "اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا" ان سابقہ آیتوں میں کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفہ وحی یا یوں کہو کہ وحی سے کتاب مراد ہے جیسے تورات، قرآن وغیرہ مراد ہے لیکن "حکمت" کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے؟ حکمت کے لغوی معنی تو دانائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے مقصود کیا ہے اس تحقیق کے لئے ضرورت ہے کہ مستند اہل لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے اور سب سے قدیم لغت نویس ابن درید النحوی ۳۲۱ھ اپنی کتاب جمہرۃ اللغۃ میں "حکمت" کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے۔

﴿وكل كلمة وعظتك او زجرتك او دعتك الى مكرمة او نهتك عن قبيح فهي حكمة وحكم﴾ (جلد ۲ ص ۱۸۶۔ حیدرآباد)

ہر وہ بات جو تم کو سمجھائے یا تم کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللغۃ میں لکھتا ہے۔

﴿الحكمة من العلم والحكيم العالم وصاحب الحكمة والحكيم المتقن للامور﴾ (جلد ۲ ص ۲۷۶ مصر)

حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا۔

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے۔

﴿والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم﴾ (ج۱۵ ص۳ مصر)

اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔

لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں۔

﴿والحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل فالحكمة من الله تعالى معرفة الاشياء وايجادها على غاية الاحكام ومن الانسان معرفة الموجودات وفعل الخيرات﴾ (ص ۱۲۶ مصر)

اور حکمت علم و عقل سے سچی اور ٹھیک بات کو پانا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کر

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے، اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں، دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد و قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و تکمیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت، صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ اس کے متعلق صحیح رائے دیتے ہیں اور حرف بحرف صحیح دیتے ہیں، اسی کا نام آپ صحیح وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری، انشاء پردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق و باطل اور اعمال کے خیر و شر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے۔ وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و وجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے۔ یہی وہ معرفت اور دانائی ہے جو جدوجہد اور کدو محنت سے نہیں بلکہ عطا و بخشش سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی کا نام "حکمت" ہے۔

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک عطا ہوتی ہے۔ اس کے مختلف درجے، دوسرے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیاء علیہم السلام کو ملتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس روحی عطیہ، آسمانی فہم، ذہنی عقل اور نورانی قوت پر "حکمت" کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت حکمت کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمانؑ کو حکمت دیے جانے کا بیان ہے اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے: اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، انابت والوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر و غرور کی ممانعت، میانہ روی اور آہستہ بولنا۔ اسی طرح تیرھویں آیت میں حکمت محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے۔ شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابت داروں اور بے کسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، غرور و فخر کی مذمت وغیرہ۔ ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ﴾ (اسراء)

یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں یہ وہ آورد باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حس اخلاقی تسلیم کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت "حکمت والا قرآن" ظاہر کی ہے ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ﴾ (لقمان، یونس) ﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ﴾ (یٰسین) ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ﴾ (آل عمران) ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حکمت کی بعض اہم تعلیموں اور باتوں کو وحی الٰہی خود اپنے اندر بھی شامل کر کے ان کو آپ کے سامنے بیان کرتی ہے۔ یہ چیز انبیاء کو کتاب الٰہی کے ساتھ عام طور پر ملتی ہے فرمایا:

کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضروری ہے، اسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے۔ اردو میں اس حقیقت کی "حکمت" کے ساتھ لفظ الہامی بڑھا کر ادا کیا جا سکتا ہے یعنی "الہامی حکمت"۔ [۱]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر، ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لاتا ہے، اور دوسرے ﴿رجل آتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا و یعلمھا﴾ (بخاری کتاب العلم) "اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے، دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے"۔ جب یہ عام انسانوں کا یہ درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی، اور وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے حصہ میں بھی آئی۔ اب اس حصول دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہئے اور وہ فیصلہ و تعلیم ہے۔ آپ کے یہ حکیمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات جو تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہے۔

کتاب و حکمت کی تعلیم:

اوپر کی چاروں آیتوں ۸۔۹۔۱۰۔۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے۔

﴿یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ﴾ (جمعہ ۱)

(وہ رسول ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا، ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے تین کاموں کا ذکر ہے۔

۱۔ خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔

۲۔ ان کو شرک اور بد اخلاقی کی نجاستوں سے پاک و صاف کرنا اور سنوارنا۔

۳۔ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو۔ اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کا کیا فائدہ؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی بطور اسی تلاوت ہی کا لفظ رکھ دیا گیا، اور اگر وہ الگ الگ معنی رکھتی ہیں، جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے، تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔ اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے نکلی ہوئی آیتوں کو پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے معنی کی تعلیم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے خصوصاً جبکہ لفظ تعلیم تلاوت کے بعد آتا ہے۔ وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہ جاتا ہے۔ کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سنا دینا یا پڑھا دینا اور دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کی تلاوت کے بعد جو آپ کا دوسرا کام تھا اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معنی کو سمجھانے اور

---

۱ [illegible]

اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کرنے کا نام "کتاب و حکمت کی تعلیم" ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعبیر تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے۔ اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی وحی کی ہوگی اور اس کی تعمیل بھی امت کے لئے ضروری ہوگی۔ آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل سے محفوظ رکھا اور وہ "احادیث و سنن" کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد "حکمت" کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو اہل لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تعبیریں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال جن کا اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں، کتاب الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں۔ کتاب الٰہی وحی ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن سینۂ نبوی کی تعلیمات حکمت کا۔ اس مقام پر امام شافعیؒ کی یہ تحقیق پیش نظر رہے۔

﴿وسنته الحكمة التي ألقي في روعه عن الله عز وجل﴾ (کتاب الرسالہ ص [illegible])

اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

اور اسی مفہوم کو ابو حیان اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحکمة فهم القرآن۔ حکمت فہم قرآن کا نام ہے۔ دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ہوا ہو، سنت ہے اور اسی معنی کو امام مالک، ابو رزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ "حکمت معرفت دین، تفقہ دین اور اس دقیق علم کو کہتے ہیں جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام بھی ہے جو خدا تعالیٰ کسی کے قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کرتا ہے۔"

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب و سینہ میں ودیعت کیا تھا اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور ثمرہ و نتائج ہیں اس لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے۔ اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم:

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں مگر ہر شے کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی۔ انبیاء کے متعلق سے اس کا جب استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً مراد خدا کی توحید، ذات و صفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی۔ حضرت ابراہیمؑ توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔

﴿يا أبت إني قد جاءني من العلم ما لم يأتك﴾ (مریم - ۳)

اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

حضرت خضر کے متعلق ہے:

علم و حکم:

بہت سے انبیاء کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے۔ حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کے نتیجہ یعنی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں۔

﴿والحكم بالشيء أن تقضي بأنه كذا أو ليس بكذا سواء ألزمت ذلك غيره أو لم تلزمه﴾ (ص ۱۲۶ مصر)

کسی شے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ایسی شے ہے یا ایسی نہیں ہے عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے۔

﴿الحكم العلم والفقه والقضاء بالعدل﴾ (ج ۱۵۔ ۲)

حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔

ان انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور صحیفہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے۔

﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا﴾ (یوسف)

اور جب یوسفؑ جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے:

﴿وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا﴾ (انبیاء)

اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے ذکر میں ہے۔

﴿فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا﴾ (انبیاء)

تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت ہے۔

﴿يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ (مریم)

اے یحییٰ کتاب (تورات) کو مضبوطی سے پکڑ، اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ (جاثیہ)

اور بلاشبہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب، حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں۔ یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے

مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس کے معنی میں یہ لفظ خالص قدیم عربی میں نہیں آیا۔ یہ اہل عجم کا محاورہ ہے۔ قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے، جیسے

﴿ فاحکم بیننا بالحق ﴾ (ص)

ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

﴿ فاحکم بین الناس بالحق ﴾ (ص)

تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

﴿ وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ﴾ (مائدہ)

اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔

حضرت داؤد اور سلیمان ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں۔

﴿ وداؤد وسلیمن اذ یحکمن فی الحرث ﴾ (انبیاء)

اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔

﴿ وما اختلفتم فیہ من شیء فحکمہ الی اللہ ﴾ (شوریٰ)

اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تینوں باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر الگ الگ دہرائی گئی ہیں

﴿ اولئک الذین اتینھم الکتب والحکم والنبوۃ ﴾ (انعام)

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت و سلطنت (اگر ہو) تو اس کے مستحق صرف دو ہیں سلیمان اور داؤد اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسفؑ اور موسیٰؑ کو بھی شامل کر لیا جائے باقی چودہ تمام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن کی عربیت کے اصلی اور صحیح اور صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ غلط فہمی کا پورا پردہ چاک کرنے کے لئے ایک اور آیت پر نظر ڈالئے۔

﴿ ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربنیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون ﴾ (آل عمران)

کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خدا والے بنو۔

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے ظاہر ہے اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں

﴿الشرح الکشف یقال شرح فلان امرہ اذا اوضحہ و شرح مسئلۃ مشکلۃ بینھا و شرح الشیء یشرحہ شرحا فتحہ وبینہ و کشفہ و کل ما فتح من الجواہر فقد شرح ایضا تقول شرحت الغامض اذا فسرتہ و شرح اللہ صدرہ لقبول الخیر یشرحہ شرحا فانشرح وسعہ لقبول الحق فاتسع۔ قال ابن الاعرابی : الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البیان والشرح الفہم﴾

شرح یعنی کشف ہے کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اس کو بیان کر دیا اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی اور یہ لفظ پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی تفسیر کر دی اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کر دیا گیا اور وہ وسیع ہو گیا۔ ابن اعرابی نے کہا: شرح کے معنی یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے نبوت کے منصب ملتے وقت دعا کی:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ﴾ (طٰہٰ)

اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معانی کے القاء اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کا مطلب سمجھیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ ﷺ کو بن مانگے ملی، خدا نے فرمایا:

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ○ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ (انشراح-۱)

کیا ہم نے (اے محمد ﷺ!) تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار دیا۔

شرح صدر اور "سینہ کھولنے" کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لحاظ سے اصطلاح شق صدر ہے یعنی عالم رؤیا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینہ مبارک کو شگاف کیا، اس کو آب زمزم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے، اور ان سے سینہ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا[1] اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعا چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک و صاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی، اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو یہ حقیقت مانی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان و حکمت سے معمور کیا گیا، بہرحال شرح صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورہ بالا معنی کو جو شرح صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بحمد اللہ اس کی تسلیم کا سرمایہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

---

[1] صحیح بخاری، [illegible] باب المعراج [illegible] و صحیح مسلم [illegible] انس بن مالک رضی اللہ عنہ [illegible]۔

﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ (زمر-۳)

بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت موثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا یقین ہو گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ یہی شرح صدر کی حقیقت ہے۔ اس روشنی کی کمی بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ "شرح صدر" کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی استشہاد یہاں مقصود نہیں بلکہ صدر اول کے کلام عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

۱۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفہ رسول اللہ ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے جان و مال مجھ سے بچا لیا' حضرت صدیقؓ نے جواب دیا خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوۃ بندوں کا حق ہے، اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

﴿ فَوَاللّٰهِ مَا هُوَ اِلَّا اَنْ قَدْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَ اَبِیْ بَكْرٍ فَعَرَفْتُ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ (بخاری، کتاب الزکوۃ)

تو خدا کی قسم یہ تھا بجز اس کے کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکر کے سینہ کو تو میں نے جان لیا کہ وہی حق ہے۔

۲۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھا لیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں بات آ گئی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں۔

﴿ فَلَمْ یَزَلْ عُمَرُ یُرَاجِعُنِیْ حَتّٰی شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِیْ لِذٰلِكَ وَرَاَیْتُ فِیْ ذٰلِكَ الَّذِیْ رَاٰی عُمَرُ ﴾ (صحیح بخاری، جمع القرآن)

تو عمر بار بار مجھ سے کہتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ سمجھتے تھے۔

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے یہی شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گذرا نور ربانی یا نور بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا

چاہئے۔ جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس کے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے، جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوتا ہے جس کو مفعول بنایا ہے لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا ایک جگہ قرآن میں ہے ﴿یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (روم) "وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں" ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے، عام علم سے نہیں لیکن دوسری جگہ ہے ﴿هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ کیا وہ جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں بلکہ مقصود عام علم ہے تو یہاں معنی ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاغت کی کتابوں میں ﴿هُوَ یَأْمُرُ وَیُعْطِیْ وَیَمْنَعُ وَهُوَ اَضْحَکَ وَاَبْکٰی﴾ کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالئے، ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لامحالہ یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے مثلاً اسلام کے لئے سینہ کھول دیا یا صحیح قرآن کے لئے سینہ کھول دیا یا مانعین زکوٰۃ کے مقابلہ کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت ﷺ کے لئے قرآن میں جس شرح صدر کا ذکر ہے اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیاء علیہم السلام کے سینے کھولے گئے۔ اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیاء کو امور دین میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوا اور یہیں سے عام امت اور انبیاء کے فرق مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امر کے سمجھنے کے لئے شرح صدر ملتی ہے اور انبیاء کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰؑ کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر احسان دونوں موقعوں پر "لی" اور "لک" ہے۔ حضرت موسیٰؑ کہتے ہیں "میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے" اور آنحضرت ﷺ کے لئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کیا ہم نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا"۔ سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لئے" کے اضافہ کی ضرورت "اور "لی" "لک" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے جیسا کہ ﴿خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ میں ہے، مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجھ کو تیرے لئے ملی ہے یعنی تیرے کشف علم کے لئے یا تائید کے لئے یا فائدے کے لئے اور یہ کشف علم اور شرح صدر خود تیری ذات کے لئے ہے کہ وہ کمال سے کمال تر ہو کر ظاہر ہو۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دین کی جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا تو دراصل یہی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو افعال و اقوال اور "احادیث و سنن" کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیین کتاب:

آنحضرت ﷺ دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور نبی آخری اور ابدی شریعت کے لئے ضروری تھا کہ وہ دنیا کو تمام تر شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے۔ چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب الٰہی کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پر نور اور حکمت و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیض یاب ہوں۔ ہر قدم و مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان سکیں۔ چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی ﷺ کو عطا ہوا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہیں۔ اس لئے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے یہ رتبہ خلفائے راشدینؓ، اکابر صحابہؓ، ائمہ تابعینؒ و تبع تابعینؒ و مجتہدینؒ، فقہاء اور علمائے علم کو بقدر ان کے مقام کے ملا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانے کے فیض یاب علوم نبوت اور حاملین اسرار شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ (قیامہ۔۱)

تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے کہ تو اس کو عجلت و شتابی میں جلدی کرے ہم پر ہے قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھنا۔ تو جب ہم نے اس کو پڑھ دیا تو تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر، پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔

اس "بیان اور شرح" کی ذمہ داری کی یہ دوسری اطلاع ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور کسی رسول کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی ہے جو کلی تواتر سے منقول اور احادیث و سنن کے متعدد دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا حسب ذیل آیت سے ثابت ہے۔

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (نحل۔۶)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تا کہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔

"بیان" اور "تبیین" کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح و تفسیر کے معنی میں۔ قرآن پاک میں یہ لفظ "تبیین" اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اب یہ تمیز کرنا کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہے سیاق و سباق اور موقع محل سے ہو سکتی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن پاک نے کہا ہے۔

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ

وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ﴾ (مائدہ)

اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کردے اور بہت سی باتوں سے درگذر کرے۔

یہاں "تبیین" صریح طور سے اخفاء کے مقابلہ میں ہے اس لئے یہاں "تبیین" کے معنی قطعی طور پر "اظہار و اعلان" کے ہیں لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے

﴿ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴾

اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری لیکن اس لئے تاکہ تو واضح کردے ان کو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لئے رہنمائی اور رحمت بناکر اس کو اتارا۔

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار و اعلان کی نہیں بلکہ توضیح و تشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو وہ توضیح و تفسیر کے بعد دور ہو جائے۔ اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہئے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے۔

﴿ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴾ [نحل]

اور ہم نے (اے پیغمبر) تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا تو اس کو ان کے لئے کھول کر بتادے تاکہ وہ سوچیں۔

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کا مفہوم ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح و تفصیل کرنے کے؟ ظاہر دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی ہو جاتے ہیں۔ مگر کسی کو اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے اور غور و فکر کے لئے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی۔ اب جبکہ آنحضرت ﷺ کے لئے تفسیر و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی بھی واجب ہوگی جس طرح خدا کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نور نبوت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو نظر آتے تھے۔

امارت:

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے جو ایک طرف اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں، پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں ان کو اتنا مختصر ضرور کیا جاسکتا ہے یعنی ان کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرادی۔ گو انسانی دماغ و حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی گنجائش اس سے بھی زیادہ وسیع اور وسیع تر ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں

روزانہ اسی قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول وکلیات کے تحت اپنے نور بصیرت اور فہم نبوت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے۔ خلفائے راشدینؓ نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لئے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت اور نور بصیرت اور امامت الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا اور یہی اصول بعد کے فقہاء ومجتہدین نے اختیار کیا۔ ہر نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلہ نبوی کے منصوص ومسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل ومشابہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معقول عدل وانصاف، رسم ورواج، مصالح عامہ، استحسان وغیرہ کے اصول پر پرکھ کر ان کا فیصلہ کیا۔ یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحی الٰہی قرآن پاک میں ہے اور آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلے احادیث وسنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں۔ وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہ گئی آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلوں کی حیثیت، تو اس کے متعلق بھی وحی الٰہی ناطق ہے۔

﴿ إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ﴾ (نساء)

ہم نے (اے پیغمبر) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو خدا نے دکھایا ہے اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرے۔

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ تجھ کو سمجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کر۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سمجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا وفیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عدل وانصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا۔ چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو دوڑے ہوئے عدالت نبوی میں حاضر ہوتے کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقے سے فیصلہ چاہتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی۔

﴿ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴾ [نور: ۴۸-۵۲]

اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑ لیتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرمانبردار بن کر رسول کے پاس چلے آتے ہیں۔ کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان

فیصلہ کرے تو وہ کہیں ہم نے سنا اور مان لیا، انہی لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ سے بچ کر چلے وہی ہیں مراد کو پہنچے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (نساء۔۹)

تو قسم ہے تیرے رب کی! وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھ کو اپنے جھگڑوں کا منصف نہ مانیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں تنگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا﴾ (احزاب۔۵)

اور کسی مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کا قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطان زمانہ کے لئے نہیں، انبیاء کے لئے خاص ہے۔ وہ نصوص کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم نبوت اور نبوت کے فیض نعمت شرح صدر، تبیین حقیقت اور فراست (دکھاتا اور سمجھاتا) کے ذریعہ فرماتا تھا لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھاتا تھا۔

آپ کے ان فتاویٰ اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے۔ آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کئے کہ آپ کے فیصلے بحکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے خطائی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے:

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت و وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں۔ جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں جن دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

﴿كٰفِرِيْنَ ٥ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ﴾ (آل عمران-١٠)

اے مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لاچکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کیونکر کفر کرو گے جبکہ تم کو خدا کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں، ایک تو آیات الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیض صحبت اور اثر سے ان کو بھٹکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا۔ اگر صرف کتاب ہی اس فرض کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی؟ اس سے یہ واضح ہوا کہ خدا کی کتاب سامت (قرآن) اس کی کتاب عملی (رسول) مستقل طور سے اس فریضہ کو انجام دیتی ہے۔ اور غالباً اس حدیث صحیح کے یہی معنی ہیں جس کا اعلان آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے واقعہ میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا۔

﴿اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ﴾

مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، خدا کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں قائم و باقی ہے اور وہی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ:

انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت ﷺ کا خصوصاً ایک امتیازی وصف تزکیہ ہے۔ تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں۔ نبوت محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف پہلے دو اوصاف سے الگ ہے۔ یہ پاک و صاف کرنا آیات الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت، فیضان صحبت، حسن اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے سے برے نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوتے، ہر طرح کی زحمتیں اٹھاتے، تکلیفیں سہتے، مصیبتیں جھیلتے اور آخر کار کفر کی تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا۔ ان کا یہ وصف تزکیہ وحی و الہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نتیجہ ہے۔ خود ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش، ہر آن آفتاب حق کی کرنیں مطلع نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

نور:

اس لیے نبوت کا سب سے صدق و صفا کا آئینہ ہوتا ہے۔ نبی کا جسم پیکر ظلمت کدہ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلع

یہ مشاہدہ وحی و الہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے خواص بصارت کے اتحاد کو ظاہر کرتا ہے۔

سماع غیب:

جس طرح آیات ملکوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسۂ باطنی بصارت کا امتیازی وصف ہے اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے۔ قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا﴾ (نساء: ۲۳) اور خدا نے موسیٰ سے بات کی۔

حضور کو حکم ہوا

﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ﴾ (طٰہٰ: ۹)

اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آوازیں سنیں۔ "نادینا" "ہم نے پکارا" بار بار یہ مضمون القرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ و دعوت:

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا۔ خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا۔ اس نے جس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اسی سمجھانے بجھانے اور راہ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تدبیر سے کام لینا۔ اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا۔ جو مصیبت درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا۔ جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں ان کو رگ گل سمجھنا۔ اس حق کی آواز کو دبانے کے لئے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا ورنہ اس سے الگ رہنا، غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور ان کی ان ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضامندی، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم۔ دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے سب نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بیکسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس روئے زمین پر وجود ہے وہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ یا براہ راست انہیں کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود کچھ سمجھنا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کردیتے ہیں اور ہر مشکل کو جھیل

یہ بھی فرمایا کہ:

﴿ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ﴾ (ہود)

میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا، میری مزدوری تو خدا پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا۔

﴿ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ﴾ (ہود)

میں اپنی تبلیغ کا بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں، میری مزدوری تو خدا پر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور ﷺ کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ "رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (بلاغ) ہے" اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف "وحی الٰہی کی تبلیغ ہے" یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک جوں کا توں پہنچا دینا اس کا کام ہے۔ اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح کرنا اس کا منصب ہے اور نہ اس کا اس کو حق ہے۔ ان کے نزدیک پیغمبر رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط کو پہنچا دیتا ہے مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس خط کے اندر کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ "رسول" سے بھی ہوا ہے جس کے لفظی معنی پیغمبر اور قاصد کے ہیں لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے نبی (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔ مبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن چراغ) صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، مجتبیٰ (مقبول) مصطفیٰ (برگزیدہ) مبین (بیان اور تشریح کرنے والا)، معلم (سکھانے والا) مزکی (پاک و صاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف و القاب اس کی اس حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے؟ جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی داں کو حق حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغمبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا۔ حالانکہ حضرات نے تو جیسا ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے شبہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شریعت وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کیلئے تسلیم کیا گیا ہے۔ وہی اصل شارع ہے۔ اب اگر رسول کو بھی وحی الٰہی سے الگ شریعت بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا لیکن اس کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں۔ کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی دفعات کی تشریح کرتا ہے تو وہ بجائے اس کے ملک کا واضع قانون کا منصب حاصل کرتا ہے۔ یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور منشا کو صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا، جس طریقہ خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے بلکہ وہ ان تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو جس کو قرآن کہتے ہیں یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں۔ الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمت ربانی کے تعلیم سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ "ہمارے رسول پر صرف پیام پہنچا دینا ہے" ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیام پہنچانے والا ہے، خوشخبری سنانے والا نہیں ہے، وہ بیدار کرنے والا نہیں، پیام الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیات الٰہی کی تبیین اور تشریح کرنے والا نہیں، رہنما اور ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے۔ قرآن میں کئی جگہ ہے۔

﴿ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ ﴾ (نازعات)

تو تو صرف ڈرانے والا ہے۔

ایک جگہ ہے:

﴿ إِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ ﴾ (ص۔۵)

میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈرانے کے سوا رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اسی قسم کی آیتوں۔

﴿ إِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ (مائدہ)

ہمارے رسول پر صرف پیام پہنچا دینا ہے۔

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیام رساں اور قاصد ہے معلم اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس کا پیغام اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبر و استیلا نہیں اور یہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر و انکار و عدم ایمان کی ذمہ داری ان پر ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں، ان کا منشا یہی اور صرف یہی ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے۔

﴿ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴾ (آل عمران)

کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے کیا تم نے اسلام قبول کیا؟ اگر کیا تو ہدایت پائی اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول) صرف پیام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں۔ اگر لوگ قبول کریں تو ان

سے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا وہ اس نے پہنچا دیا۔ اس کا فرض ادا ہو چکا اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں۔

﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ (رعد۔۶)

تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔

اس کی مزید تفصیل سورۂ غاشیہ میں ہے۔

﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ (غاشیہ۔۱)

تو اے پیغمبر! تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، ان پر داروغہ نہیں۔ لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا۔ بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہمیں پر ان کا حساب ہے۔

یہی مضمون سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے۔ وہ سلطان، ڈکٹیٹر، داروغہ اور فرمانروا بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوائے۔

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾ (شوریٰ۔۵)

تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ہے، تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا، انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔

﴿قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ۝ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (یٰسٓ۔۲)

کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو۔ خدا نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ کہتے ہو۔ رسولوں نے جواب دیا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا۔ پیغمبروں کا فرض لوگوں کو منوانا نہیں، بلکہ ان تک ہمارا پیغام پہنچانا ہے۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (نحل۔۵)

اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے۔ (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے، تو کیا اور پیغمبروں پر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے؟

﴿وَإِنْ تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (عنکبوت۔۲)

اگر تم جھٹلاتے ہو (تو کیا ہے) تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی عذاب و ثواب خدا پر ہے جو کرے۔

﴿ مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴾ (۱۰۰)

رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا اور خدا جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں۔

﴿ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ (مائدہ)

اور خدا کا فرمان اور رسول کی اطاعت کرو اور بچو لیکن اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

﴿ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ ۖ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ (نور-۷)

کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول پر وہ ہے جس کا اس پر بوجھ ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

﴿ كَذَٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ ۝ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ (نحل-۱۱)

اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا تاکہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر سوا اس کے کچھ نہیں کہ کھول کر پہنچا دے۔

﴿ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴾ (تغابن-۲)

اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو۔ اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

پیغمبر کا قول ہے۔

﴿ فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ﴾ (ہود-۵)

تو اگر تم منہ پھیرتے ہو تو جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت و پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت کو حاصل کر لیں تو پھر ان کا تعلق رسول سے پھر اتباع و پیروی و اطاعت کا ہو جاتا ہے اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے۔ کوئی حکومت دوسرے ملک کے کسی باشندہ کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیاء کی تعلیم کا امتیازی پہلو

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے۔ وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادات، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرسش۔ اس لحاظ سے انبیاء کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں اس لئے فرمایا کہ ﴿ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا ﴾ یعنی خدا نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جو نوح وغیرہ

دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے"۔ لیکن انبیاء کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی و ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گذرے ہوں ان کی دعوت بھی مفید ہو ان کے اخلاق و عادات بھی دل پسند ہوں وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے اوتار لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں کیونکہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے۔ اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں فرمایا

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ (انبیاء)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں میری ہی پرستش کرو۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (نحل)

اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے۔ اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم جزء توحید نہیں اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت:

انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض و غایت کو شعراء نے زبان اور خطیبانہ جوش بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو خود رسول اللہ ﷺ کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اصل وحی وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو نہ کہ گواہ۔

انبیاء کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمان بندگی کی یاد دہانی ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ﴾ (اعراف)

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے ہم نے گواہی دی کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔

اس لئے ضرور ہوا کہ ان کو موقع بموقع اس کا یہ عہد و پیمان یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے۔ ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ عذر کریں کہ ہم کو کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا تو فرمایا۔

﴿رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (نساء)

رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت و رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کے مظہر اور مورد

ہیں اسی لئے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لئے ہادی کا لفظ آیا ہے فرمایا

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (رعد)

اور ہر قوم کے لئے ایک راہ دکھانے والا آیا۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا۔

﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (شوریٰ)

اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے۔

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا﴾ (انبیاء)

اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی تھیں بار بار ھدیٰ (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو ضیاء اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت اور رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگان الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔ انسان جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں۔

﴿هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ (حدید)

وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تاکہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے۔ جب بھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے افراط و تفریط پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا۔ انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، یعنی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے۔ آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے۔ کیمسٹری اور علم الافلاک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی بیشی نہیں ہے۔ جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے۔ عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی ترازو کو حق اور عدل سے فرمایا

﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ توازن اور برابر تول جس پر اس دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں قادر فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے یہی توازن اور برابری تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزان شریعت

کے مطابق قدرتی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہئے۔ بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے اور بالا رادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے۔ بے ارادہ دنیا کا نظام عدل اسی خدائی میزان فطرت سے قائم رہا ہے۔ اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی طرح انسانی دنیا کی سلطنت، جماعت اور امن وامان کا نظام اسی میزان شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے فرمایا:

﴿ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ (حدید)
ہم نے بھیجا اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ عدل کو قائم کریں۔

نبوت کی بعثت کی یہ غرض وغایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں اس موجودہ دنیا کے نظام کی امن وسلامتی کے لئے ہے۔ آج یورپ کے الحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پرشور بنا دیا ہے آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک وشبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے لیکن ہم کی دنیا کی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو آج جہاں کہیں بھی سچائی کی کوئی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے وہ اسی مطلع خورشید سے چھن کر نکلی ہے۔ کوئی دین دار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحارئی کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، مجوسی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مسیحی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں، جس بھی ہو کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے؟ آج جہاں بھی عدل ومیزان کا وجود ہے وہ کسی جزئی حکیم یا بامروت فلاسفر کی تعلیم، تصنیف وتقریر وخطبہ کا اثر نہیں ہے بلکہ انبیاء ہی کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین سطح کی گمراہی میں عدل، احسان، ہمدردی، نیکوکاری، حسن خلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت انہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے۔ جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں، جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کی بھی نیکوکاری انہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضان تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر جو لوگ ذاتی طور پر پیغمبروں کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں، اسی لئے انبیاء کا وجود تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے۔ قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار ہدایت اور رحمت اور روشنی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے وہ تمام تر اسی غرض وغایت کی تشریح ہے اسی لئے خاتم نبوت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات والا صفات تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئی فرمایا:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾ (انبیاء)
اور ہم نے تجھ کو اے محمد! تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تائید و نصرت:

انبیاء علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں کتنی ہی

تکلیفوں اور محنتوں کا سامنا ہوتا تا آخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے۔ قرآن نے کہا:

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ○ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ○ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴾ (صافات)

اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لئے پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً انہیں کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا لشکر ہی غالب ہوتا ہے۔

نہ صرف اسی دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہیں کو اور ان کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیابی ہوگی۔

﴿ إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴾ (مومن)

اور بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے جس دن ستمگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے۔ ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لئے برا گھر ہوگا۔

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں جب ان کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری ناامیدی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعۃً صبح کا نور افق سے نکلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے۔ فرمایا۔

﴿ حَتَّى إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا ﴾ (یوسف)

یہاں تک کہ جب پیغمبروں کو اپنی قوم کے ایمان سے ناامیدی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آگئی۔

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت و حفاظت دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو آسان سمجھ لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں۔ مخالفوں کی فوج و لشکر، تیغ و تبر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی وقت بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے۔ منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بے چارگی اور تنہائی کو دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس گمان کی تردید کر کے فرماتا ہے

﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ ﴾ (ابراہیم)

سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی۔

﴿ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ﴾ (مجادلہ)

اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب رہوں گا اور میرے رسول۔

خاتمہ: اس تفصیل اور تشریح سے مقصود قرآن میں نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا۔

شب ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی تنگی تحت اس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تاریکی میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور اس کی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لئے پیغمبر اور دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما چکے۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ۔ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ﴾ (فتح)

جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی، اخلاقی، معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج، چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، انہیں کے معبد تھے اور انہیں کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بدھ مت کے پیرو، اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مترادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ صدی قبل تزکیہ نفس کے پھول برسائے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کی چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا [illegible] نکالا تھا مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا مسکن بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسر پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا، حرص و طمع اور ہلاکت و خون کی گرم بازاری تھی، نفس انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل و راستی اور پاکبازی و پارسائی کے عطر معطر کی خوشبو انسان کے جامۂ ہستی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور ہدایت

دیویوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالمگیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، نئی نوع انسانی کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو اوراق صد ہا سال سے پراگندہ و منتشر ہو رہا تھا، پھر نظم و انتظام پیدا کر دے اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سر نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا، تفصیل کے لئے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہئے۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟:

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مصر، ایران، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانہ پارینہ بن چکی تھی اور عرب و مضافات عرب میں جو سلطنتیں کبھی تھیں مثلاً عاد، ثمود، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گذری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبح سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا پر حکمران تھیں، وہاں کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے، اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو تھیں، فارس اور روم، فارس کا مذہب مجوسیت تھا، جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک پھیلا تھا، اور روم کا مذہب عیسوی تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں پر محیط تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے، اور وہ یہود اور ہنود ہیں۔

مجوسی فارس:

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوج کمال پر تھا، مگر عہد بعثت سے ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال[1] گھٹتے گھٹتے سایہ سا رہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی ہنگاموں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم و ستم اور امراء کی عیش پسندیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاق اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر جس کے خمیر سے قوموں کی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے بےنشاں کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنا آتشکدہ روشن کیا اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزداں و اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی معبود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا، جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایک ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب نہ ہوا، اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران و برباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی

---

1. کتاب [illegible] و کتاب البدء و التاریخ مقدسی ذکر فرقہ مانویہ۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ نوشیرواں نے لی ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدولت ملا مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبا دیا اور کیش زردشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد مسیحیت پرستی کی طرف مائل تھا اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زردشتیوں سے مصاف آرا ہوا اور مارا گیا۔[1]

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا تخت ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بد نظمی اور باہمی خانہ جنگی بادشاہوں کی تغافل شعاری اور امراء کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ ۶۳۲ء میں مجاہدین اسلام کی تیغ ہندی کے طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمۂ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی اخلاق کے محمود ابواب بھی ان کے دین میں کبھی داخل نہیں ہوئے یزداں و اہرمن نور و ظلمت اور خیر و شر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور ان مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا انہوں نے جواب میں کہا ہم عربوں کا یہ دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔[2]

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تقریباً پانچ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہو گیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی اس لئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شعاعوں کے لئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا سرجان ملکم جن کا مسیحی تعصب عساکر اسلامی کو ان کی زبان سے "قزاقان عرب" کا لقب دلاتا ہے فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں۔

یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لئے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تخت جو بقول "سوسمار خوراں" کے ایک وحشی نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب بیابان کے مغرور ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہو سکتا [مسلمان] فارسی مورخین گو اپنے حب وطن اور بیجا پیغمبر پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزہ عظیم خیال کرتے ہیں جس کے ذریعے سے خدا نے محمد کی صداقت کو ظاہر کر دیا تھا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آ جاتا ہے کہ فارس کی ایک سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی ہو جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے بکمر خستہ و ناتواں ہو اور جو اپنی کبر سنی اور نقاہت سے قعر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو اس کے لئے یہ جوش "قزاقان عرب"

---

1. ازرا اخبار الفرس طبری ص ۹۵ وغیرہ۔
2. تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ صفحہ ۲۲۷۲ طبع یورپ۔

کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔[1]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک تر ساسانیوں کی شکستگی و ناتوانی اور نقاہت و کمزوری قرار پائی عرب کی کامیابی کی تمہید کیوں بنی؟ کیا پہلے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے جو عراق و ایران کے اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے؟ واقعہ یہ ہے کہ زردشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی تو روحانیت ختم و ثنویت دوئی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کردی تھی" یزداں اور اہرمن" کی دوگانہ حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کردی تھی۔ بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہوگئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجون مرکب تھا۔[2] فرقہ مزدکی فرقہ کی بے ہودہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا۔[3] نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں "بادشاہ عادل و دادگر" کا خطاب پایا تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ابھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

عیسائی روم:

آغاز اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے روم کی قیاصرہ سلطنت اس سے کچھ کم پژمردہ نہ تھی حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی، اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لئے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مرادف بن گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی سلطنت میں مبعوث ہو کر دنیا کو امن و صلح کا پیغام سنا کر رخصت ہوئے۔ ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوگئیں اور بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصل مسیحیت ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگئی اور باپ بیٹے روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہوگیا اور آج تک وہ ہے جس کو کوئی تو کیا خود حضرت عیسیٰ بھی سمجھ نہیں سکتے تھے گویا اب ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پاپ) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے لعنت۔[4] قرار پائی۔ ۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہوگئے مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا، مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا نتیجہ یہ ہوا کہ باپ بیٹے اور روح القدس کی مشترک الوہیت میں جو نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا تھا قوت سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی اجارہ داروں میں یہ حوصلہ پیدا کردیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کردیا اس کے لئے ملک گیری

[1] سر مالکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول صفحہ ۱۲۳۔

[2] تفصیل کے لئے فہرست ابن ندیم صفحہ ۴۴۳ مصر۔

[3] گبن جلد ۵-۶-۱۵۱۔

[4] یہ اضافہ جناب حسن کی تالیف سے ماخوذ ہے جو بحیثیت مذہب ہیں۔

ختم تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی اب شاہ جسٹینین کے زمانہ میں (یعنی ۵۲۷ء میں) گھٹ کر ایک چوتھائی سے کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں۔ رعایا کی بستیاں خالی تھیں فوج کی تنخواہیں چڑھی جاتی تھیں اور امراء و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح کے جعل، فریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے۔ فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے۔ فوجی افسران جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی ہزیمت و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کرے۔[1]

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد تھا کہ بیرونی مہم اہل روم کو ایک دم کے لئے فکر سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا۔ جرمن، ہن، گاتھس اور وینڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین ﷺ کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گبن کی زبان میں اس کی مثال بعینہ اس عظیم الشان درخت کی ہو گئی تھی جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آباد تھیں مگر اس پر ایسی خزاں آ گئی کہ برگ و بار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں اور صرف خالی تنا خشک ہو رہا تھا۔ خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے۔ تھیٹر، بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اب ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تسکین کر سکیں۔[2]

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے۔ بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی وہ باپ بیٹا روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے۔ حضرت عیسیٰ اور مریم و روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کے تعین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گذر کر جنگ و جدل کی نوبت آ گئی تھی یہاں تک کہ ۵۱۲ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔[3] اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آ جاتی۔ پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور اس بناء پر محض حب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے

---

۱ گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم جلد ۴ صفحہ ۳۶۱۔

۲ گبن جلد ۴ صفحہ ۳۴۶۔

۳ گبن جلد ۴ صفحہ ۳۳۲۔

بہرحال مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لئے باعث ننگ ہے مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا حضرت مسیح کی ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تکمیل 'مصر کو قابو میں لانے کے لئے کی گئی تھی' جس سے حضرت مسیح کے "وہ ایک ہے" کی تعلیم ہمیشہ کے لئے ان کے مذہب سے مٹ گئی ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے[1] مسیح و مریم روح القدس اور حوارئین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔[2]

سیل صاحب ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"گرجا کے پادریوں (CLERGY) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کروا لے تھے اور امن محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لئے باعث ننگ ہیں مذہبی صورت میں قائم کئے گئے خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔ نیس کونسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا اور ایریس سلیس نسطوریس اور یوٹیکیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں مغربی چرچ میں ڈیمس اور سلیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لئے قتل تک نوبت پہنچا دی اور آخر ڈیمس کی فتح ہوئی اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سسی نینس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے اس لئے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے۔ جسٹنین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو برائیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہو گئی ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی پر اڑاتے تھے۔ عقائد کی خرابی کے علاوہ روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لئے مشہور رہے تھے؟ آنحضرت ﷺ کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ (GOTHS) لوگوں نے روند ڈالا تھا، یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاق خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔ رومیوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ "دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر

---

۱ سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المراۃ۔

۲ سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ صفحہ ۶۹-۷۵۔

تھیں لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ڈریپر نے بیان کی ہے حقیر ہو کر ایک عام پست گر
بداخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر غالب ہو گیا
عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا مریم عذرا کو (خدا کی ماں) کا لقب دیا گیا [۱] ......

اسی زمانہ میں ایک گروہ "مریمی" کے نام سے پیدا ہوا جو کہ حضرت مریم کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلاثہ کے اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے۔ اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کئے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلاف باہمی نہایت شدومد سے پیدا ہوئے یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیے کے لئے حکومت کو بار بار دست اندازی کرنی پڑتی تھی رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے مذہبی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔ [۲]

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لئے کشت و خون ایک عام معمولی واقعہ تھا یہاں تک کہ بعض وقت مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لئے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے [۳] اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر، حصول لذائذ اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذریعے تھے چنانچہ جتنی تعیش بڑے بڑے پادریوں کے دسترخوان پر ہوتی تھی اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ [۴]

سلاطین اور مذہب کے حاکمین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بے دردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہو و لعب و عیاشی میں اڑا ڈالتے۔ [۵]

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے جو وہ زمین پر کھول دیتے تھے وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون ا

---

۱ معرکۂ مذہب و سائنس ڈریپر ص ۴۲

۲ ایضاً صفحہ ۴۵، ۴۶

۳ سیل صاحب کا ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۶

۴ ایضاً صفحہ ۲۶

۵ ایضاً صفحہ ۲۸، ۴۹

۶ تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔

لئے۔ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔ دینداری کا سب سے اہم جز تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کے تکلیف دہ عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی؛ کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی؛ کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا؛ کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا؛ کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند کر لیا تھا۔ ماں باپ اور عزیز و اقارب، دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ میں کانٹے تھے؛ ان سے پرہیز بلکہ ان سے نفرت کمال تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان:

دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی با اثر مذہب قائم تھا ایک ہندوستان بھی ہے؛ ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گذرے ہیں؛ ایک اصلی ہندو ویدک عہد، جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک قائم رہا؛ دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوؤں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو سال ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح تک رہا؛ تیسرا دور عقلیت جس میں حکما اور متفلسفین کا دور دورہ تھا اور جو ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا؛ چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا؛ پانچواں دور پرانک جس میں بجائے وید یا گوتم بدھ کی تعلیمات کے پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد ہوتا تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مورخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے۔

(۱) شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا تھا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔[1]

(۲) ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہو گئی۔[2]

(۳) مندروں کے مجاورین بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے۔[3]

(۴) ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یکجائی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی جو نظام معاشرت کے لئے تباہ کن تھی۔[4]

---

[1] آریائی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ ۲۷۶

[2] آریائی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ ۲۸۱

[3] آریائی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ ۲۸۳

[4] ایضاً صفحہ ۳۰۷

(۵) عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا تھا۔[1]

(۶) قوانین اس قدر غیر معقول و غیر منصفانہ وضع کئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری و حمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا۔ مثال کے لئے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھولے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہئے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہئے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہئے۔[2]

(۷) راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالت خمار میں جامہ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔[3]

(۸) شاہراہوں پر آوارہ گردی اور جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔[4]

(۹) خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

(۱۰) اوہام و خیالات فاسدہ بھوتوں پلیتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون و اوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سر بسجود ہونا ان کا دھرم تھا۔ جن دیوتاؤں اور دیویوں کا شمار اندازہ و قیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانہ حمد تھا۔ ظہور اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپسیا کرنے والے جوگیوں کے دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر افسوس آتا ہے۔[5] اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گذرے ہیں ان کے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں[6] وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کے رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں ایک عورت کے کئی کئی شوہر[7] ہوتے تھے وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت

---

[1] ایضاً صفحہ ۳۳۱
[2] ایضاً ۳۳۳، ۳۳۲
[3] آر سی دت کی ہندوستان قدیم صفحہ ۲۰۹
[4] آر سی دت کی ہندوستان قدیم صفحہ ۲۰۹
[5] دیکھو ابو زید سیرافی کا سفرنامہ صفحہ ۱۸۱ [illegible] صفحہ ۸۱
[6] [illegible] صفحہ ۳۰ [illegible] ہندوستان قدیم صفحہ ۲۹۳
[7] [illegible]

سے عمر بھر کے لئے قانوناً محروم کر دی جاتی تھی اور اسی لئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ در آتش ہونا پسند کرتی تھیں لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مردکو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے [1] مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی اور پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

اس مختصر سے خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ابتداء اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار عرب و روم ہو رہے تھے۔

یہود:

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اسی قوم سے ہو سکتی تھی جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانت دار بنی اس لئے قرآن نے ان سے کہا ﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ (بقرہ) اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الٰہی کے منکر نہ ہو مگر یہ قوم سخت جانی کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا۔

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (بقرہ)

ان کے دل پتھروں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل کر ڈالا حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہیں آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو چنانچہ خود قرآن مجید نے کہا۔

﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ (مائدہ)

بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے ان کا کام کتنا برا ہے۔

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے

1. [illegible]

﴿ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾ (بقرہ)

اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے یہ اس لئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔

﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (بقرہ)

کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے تم قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے۔

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (آل عمران)

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھاتا ہے تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا ان کی مذہبی تنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک ساتحہ وہ ہے جو اسلام سے ۷۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درد داستان کو ان لفظوں میں انھیں یاد دلایا۔

﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴾ (بروج)

ترجمہ: اے لوگ مارے گئے جو بھڑکتی آگ کے گڑھے والے تھے جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقے سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے۔

۱۔ ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا۔

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ (مائدہ)

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ (بقرہ)

اور کہا ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی لیکن چند روز۔

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لئے خاص ہیں قرآن نے کہا:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (بقرہ)

کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں۔ قرآن نے ان کے جواب میں کہا۔

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (جمعہ)

یہ خدا کی مہربانی ہے وہ جس کو چاہے دے۔

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشاء اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لئے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ ۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ﴾ (مائدہ)

وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (بقرہ)

تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے۔

﴿ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِىَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾ (بقرہ)

اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا علم نہیں لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے۔

﴿ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڏ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِھِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ)

جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔

﴿ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴾ (بقرہ)

کیا جب جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے موافق نہ ہو تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔

ایک دفعہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لائے آپ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں آپ نے ان سے تورات طلب فرمائی جب وہ لائے تو اس جرم کے متعلقہ حکموں کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگساری کا حکم چھپا دیا مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا آپ نے فرمایا خداوندا میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کروں گا (صحیح بخاری، مسلم کتاب الحدود و ابوداؤد باب رجم الیہودیین)

آپس میں قتل وخونریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ان میں ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے تھے قرآن نے کہا۔

﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ (بقرہ۔۱۰)

پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو اور ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حصوں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

۲۔ دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے

﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ (بقرہ)

ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے، مشرکوں سے بھی زیادہ ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس طرح کی تنگی اور بد دیانتی کے ساتھ بھی برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں، قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہل کتاب کی نسبت فرمایا۔

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آل عمران)

کتاب والوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لئے دو تو تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ ہو اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔

توراۃ میں "اپنے بھائی" کے علاوہ "اجنبی" سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود یہود سے نہ لے اور اہل عرب جو یہود نہ تھے ان سے بھاری سے بھاری شرح سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علماء ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے اس حرام خوری اور ان کے علماء کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا

﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴾ (مائدہ۔۹)

اور ان میں سے بعضوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے کرتوت کتنے برے ہیں۔ ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں باز نہیں رکھتے ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾ (مائدہ)

جھوٹ کو سننے والے اور حرام کھانے والے ہیں۔

﴿وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ (نساء)

اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے

اسی سے تو وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کر کے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ وہ ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے فرمایا۔

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (مائدہ)

ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق پیغمبر جو فرمانبردار تھے یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے اور ان کے درویش اور عالم بھی خدا کی کتاب کے ان حصوں کو جنہیں انہوں نے بچا رکھا تھا ان ہی سے فیصلہ کرتے۔

اس کے بعد اس کے احکام کے اجراء اور قتل کے قصاص کا ذکر کر کے فرمایا۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (مائدہ)

اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں۔

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے تھے وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ... اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ﴾ (نساء)

اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ۔ بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا﴾ (نساء)

..... کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا وہ جبت اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کافر مسلمانوں سے زیادہ ٹھیک راستہ پر ہیں۔

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا تعویذ گنڈا جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان کی تعلیم ہے (بقرہ) لبید بن اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے تھے۔ ۱

۱ صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الطب باب السحر صفحہ ۸۵۸۔

نہ بنیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔

یہی بھی عداوت اور دشمنی ہی کی مختلف دکھائی دیتی تھی اس لئے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلہ میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ﴾ (توبہ) اپنی دولت و ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے ﴿يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ﴾ (مائدہ) "خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں" قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ﴾ (بقرہ) ان فقروں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزیں تھیں ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا سیاسی اہمیت و وحدت ہوائی ہو چکے تھے ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بے تابانہ انتظار کر رہے تھے (بقرہ) خود عرب میں یہود اس وقت جس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے تورات کے صفحے بھرے تھے اور انہیں سے سن کر یثرب کے اوس و خزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئیوں سے باخبر تھے۔

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صبح سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس فٹ تھی تو اس کا پایہ تخت مآرب اور اس کے اطراف دفعۃً تباہ و برباد ہو گئے، یہ دوسری[1] صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیل عرم کہا ہے۔ اس سیلاب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلا وطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے جس سے نظام سلطنت میں ضعف آ گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمانروا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا، رعایا نے بغاوت کی اور شاہ حبش سے اعانت چاہی اس نے ۵۲۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۶۰۳ء میں قبیلہ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا اور یمن شہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے[2] چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا اس لئے رفتہ رفتہ وہ عیسائی ہو گیا اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادیاں تھیں اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے باقی تمام ملکوں میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے ہوئے تھے لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد:

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانہ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں ان پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلہ ہے عرب شمال کے عرب جو نباطی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا مثلاً زید اللہی، عبد اللہی[3] خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے۔

---

[1] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لئے اس کی تعیین میں کئی نظریے ہیں۔ ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا۔ (سلیمان)

[2] اکثر علمائے انساب کا بیان یہی ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان)

[3] مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۶۶۴ بحوالہ پروفیسر نولدکی۔

﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ (لقمان-۳)
اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیے تو وہ بول اٹھیں گے کہ خدا نے، تو کہو خدا کا شکر ہے۔

یہ غالباً حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم کا بقیہ اثر تھا، لیکن شرک کا اعتقاد یہ پیدا ہو گیا تھا کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں گو خدا ان میں سب سے بڑا ہے۔ یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ ان معبودوں کے انکار سے ان کو اسی قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں انہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے وابستہ تھیں اور کام انہی خداؤں سے پڑتا تھا اس لئے اللہ کا خیال بھولوں کی طرح یاد آتا تھا انہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے انہی پر قربانی چڑھاتے تھے انہی سے مانگتے تھے۔ سمجھتے تھے اللہ نے زمین آسمان بنا کر بیکار سا ہو چکا تھا انہی کو پکارتے تھے انہی خداؤں پر اصرار کرتے تھے یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا تنہا نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے۔

﴿وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾ (زمر-۵)
اور جب تنہا اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو جو لوگ قیامت کے معتقد نہیں ہیں ان کے دل جل جاتے ہیں لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش رہے گا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے چنانچہ وہ کہتے تھے۔

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (زمر-۱)
ہم ان بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔

ملائکہ کی الوہیت۔

شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں چنانچہ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيُسَمُّونَ الْمَلٰئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثٰى﴾ (سورۂ نجم)
جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔

﴿أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزٰى﴾ (نجم-۱)
تمہارے لئے تو بیٹے اور خدا کے لئے بیٹیاں یہ تو بھونڈی تقسیم ہے۔

اسی طرح بعض یہود عزیرؑ کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے، وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے۔

﴿وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰئِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا﴾ (آل عمران)
اور نہ تم کو وہ یہ حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔

تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے قرآن میں ہے ﴿ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴾ (جن) "اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا تھا" چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی اور ان میں سے ایک مشہور مقام وراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں (مکان الدراہم) پر جانور ذبح کر کے چڑھائے جاتے تھے تا کہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے۔[2]

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ﴾ (اعراف)

خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔

بت پرستی:

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے ان کے بت بنا لیتے تھے اور جا بجا عظیم الشان بت کدے قائم ہو گئے تھے یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا اٹھا لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے جہاں کوئی پتھر ہاتھ نہ آیا خاک کا ایک تودہ بنا لیا ایک بکری لا کر اس کا دودھ اس پر دوہا پھر اس کے گرد طواف کیا اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلہ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا ایک دفعہ بلقاء گیا اور وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لا کر کعبہ میں نصب کیا چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا اس لئے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے ان میں ہبل سب سے بڑا تھا اس سے اتر کر مناۃ لات اور عزیٰ تھے۔

مناۃ مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے قبائل اسی کا حج کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آ کر اتارتے تھے حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبد العزی مزنی کہتا ہے۔[3]

﴿ انی حلفت یمین صدق برۃ بمناۃ عند محل آل الخزرج ﴾

میں نے مناۃ کی سچی قسم کھائی اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔

لات قبیلہ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا۔ اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے

---

۱ لسان العرب لفظ سکن۔

۲ کتاب الاصنام ہشام بن الکلبی مطبوعہ مصر صفحہ ۳۴۔

۳ یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ مناۃ میں ہے۔

عزیٰ ایک درخت تھا اس کے پاس ایک بت تھا یہ قبیلہ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے۔[1]

﴿ وَاللَّاتِ وَالْعُزّٰى ، وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةِ الْاُخْرٰى ، اِنَّهُنَّ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى ﴾

لات عزیٰ اور تیسرا منات یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دی جانوروں سے گزر کر انسانی قربانیاں چڑھائی جانے لگیں آنحضرت ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحبزادہ عبداللہ کی قربانی کرنی چاہی تھی اسی رسم کی تقلید تھی۔

بحیرۃ، سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔[2] بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے ان میں سے ایک پر "ہاں" ایک پر "نہیں" لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے "ہاں" کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسموں کی تھیں۔ اصنام واوثان، انصاب اور بیت، اصنام واوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے، اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو خشب کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالے سے بنتے تو ان کو دمیہ کہتے انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، ذوالکعبات، قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کیے جاتے تھے جن بتوں کے اردگرد چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی اس کو عتیرہ کہتے تھے پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو دبر کہتے تھے جاہلی شاعر کہتا ہے۔

﴿ کما طاف بالرجمۃ المرتجم ﴾

جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف لگانے والا طواف کرے۔[3]

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی ان کی کوئی انتہا نہ تھی

ع "قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا"

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت تھے (صحیح بخاری باب فتح مکہ) ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) لات (۲) عزیٰ (۳) منات (۴) یغوث (۵) یعوق (۶) نسر (۷) ود (۸) سواع (۹) ہبل لیکن جاہلیت کے پرانے مورخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعراء کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کیے ہیں ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جو اب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس ۳۰ بتوں کے نام ہیں علامہ ذکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء میں تصحیح اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں

---

[1] معجم البلدان لفظ لات و کتاب الاصنام للکلبی مطبوعہ دار الکتب المصریہ ۱۳۴۳ھ صفحہ ۱۹

[2] نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام صفحہ ۲۱۰

[3] ان الفاظ کے لئے دیکھو لسان العرب

عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے گئے ہیں ان میں العزیٰ، منات، تیمان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگا ہے میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۳۳ھ و ۱۹۱۵ء میں چھپی جہاں معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جوان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف۔
عزیٰ	قریش و بنو شیبان بن جابر۔
مناۃ	اوس و خزرج و دوسرے عرب۔
یغوث	بنو مذحج اور اہل جرش۔
یعوق	ہمدان و اہل خیوان۔
نسر	حمیر۔
ود	بنو کلب۔
سواع	بنو لحیان۔
اساف	بت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
نائلہ	بت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر	قضاعہ، لخم، جذام، عاملہ و غطفان۔
باجر	ازد، طی و قضاعہ۔
ذوالخلصہ	بنوامامہ، خثعم، بجالہ، ازد السراۃ۔
رضاء و رضی	بنو ربیعہ بت خانہ۔
زمام	عنیزہ کا بت خانہ۔
سبکہ	
سعد	بنی ملکان بن کنانہ۔
سعیر	عنزہ۔
ذوالشریٰ	بنو حارث۔
عنم	ازد السراۃ۔
عم انس یا عمیانس	خولان۔
فلس	طی۔

ذو الکفین	بنو دوس۔
مناف	قریش۔
نہم	مزینہ۔
ہبل	قریش۔
یعوق	قبائل بنی ہمدان۔
یعبوب	جدیلہ (بنی طے)۔
اشہل	بنو عبد الاشہل۔
اوال	بکر و تغلب۔
بس	غطفان کا بت خانہ۔
جہم	ایک لکڑی کا بت۔
تیج	ایک بت۔
جب	ایک بت۔
جریش یا جرش	ایک بت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے۔
جلسد	ایک بت کا نام۔
جہار	ہوازن کا معبود۔
دار	بنو عبد الدار۔
دوار	ایک بت کا نام۔
ذو الرجل	حجاز کا ایک بت۔
شارق	ایک بت کا نام جس کی طرف عبد الشارق کی نسبت ہے۔
شمس	بنو عبد شمس۔
صدا	عاد کا بت۔
صمود	عاد کا بت۔
ضمار	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ۔
عمرات	مضر و کبیر۔
عجعب	قضاعہ۔
عوض	بکر بن وائل۔

پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن ۱؎ رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے وہ اپنی شکل و صورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لئے جاتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے سامنے سے ایک آدمی گزرا انہوں نے قیافہ سے اس کو پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی؟ اس نے کہا میں نے ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا۔

﴿ الم تر الجن وابلاسها ويأسها من بعد انكاسها ولحوقها بالقلاص واحلاسها ﴾

کیا تم جنوں کی سراسیمگی ان کی نا امیدی اور ان کے اونٹوں کی ابتری نہیں دیکھتے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ سچ کہتا ہے میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لاکر ذبح کیا اس کے بعد ایک شخص نے زور سے چلایا۔

﴿ یا جلیح امر نجیح رجل فصیح یقول لا اله الا الله ﴾

اے جلیح کامیاب امر ایک فصیح شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے۔

اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی ۲؎ صحیح بخاری (تفسیر سورۂ والضحیٰ) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات کو عبادت کے لئے نہیں اٹھے اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آکر آنحضرت ﷺ سے کہا۔

﴿ انی ارجو ان یکون شیطانک قد ترکک ﴾

میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لئے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے۔ قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے۔

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴾ (شعراء)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتا ہے شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر اترتا ہے جو سنی سنائی بات القا کرتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا ان میں سے مازنی، شق، سطیح، عزی بہت مشہور تھے جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کئے ہیں۔

﴿ والارض والسماء والعقاب والصقعاء واقعة ببقعاء لقد نفر المجد بنی العشراء للمجد والسناء ﴾

۱؎ کتاب البیان والتبیین للجاحظ جلد اول صفحہ ۲ مطبوعہ مطبع مصر۔

۲؎ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۵۴۵

المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے۔

﴿هذه الحروب لا يستقصيها الاحصاء فاقتصرت على ما ذكرت﴾ (جلد دوم صفحہ ۔۔)

یعنی ان کا استقصا نہیں ہو سکتا اس لئے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس پر میں نے قناعت کی۔

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں ان میں سب سے مشہور لڑائی عبس و ذبیان کی ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی۔ یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کی چراگاہ میں چلی گئی کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کر دیا اس بات سے قبیلہ میں آگ لگ گئی کلیب جان سے مارا گیا اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا چند روز کے بعد موقع پا کر ایک کو قتل کر دیا گیا اس کے انتقام کے لئے خون کی ندیاں بہیں۔ بکر و تمیم میں ایک چراگاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی اوس و خزرج مدینہ کے دو قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آ گئے اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے، ایک اور مشہور لڑائی کا نام یوم ذی قار ہے۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا، ان میں لڑنا دوسرے جاہلیت کا شرف اور ایک قبیلہ کی آن بھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی ان لڑائیوں میں سفاکی بے رحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

شراب خوری:

شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور و مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میکدہ بن گیا تھا اس کا اندازہ اس قدر ہو سکتا ہے کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا ان کے نام یادگار رکھے گئے تھے دوست احباب کسی گھر میں جمع ہوتے شراب کا دور چلتا ساتھ ہی جوئے کھیلے جاتے ان میں اونٹوں کی بازی جیت ہوتی جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کر کے لوگوں کو کھلا دیتا بلکہ نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا اور لوگ گوشت بھون بھون کر کباب لگاتے اور کھاتے اور کھلاتے اور پھر اس بے جا فیاضی پر فخر کرتے سامنے گانے والی عورتیں گاتی بجاتی تھیں اور اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے۔ جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے۔

فان تبغني في حلقة القوم تلقني ۔۔۔ وان تقتنصني في الحوانيت تصطد

اگر تم مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈو گے تو پاؤ گے اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہو تو کر سکتے ہو

۱؎ [illegible] تفصیل حالات [illegible]

متی تأتنی اصبحک کأساً رویۃ　　وان کنت عنہا غانیاً فاغن وازدد

جب کبھی تو میرے پاس آئے گا میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر آئے تو جا اور بے نیازی زیادہ کر

ندامای بیض کالنجوم وقینۃ　　تروح علینا بین برد ومجسد

میری محفل شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس کبھی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔

رحیب قطاب الجیب منہا رقیقۃ　　بجس الندامی بضۃ المتجرد

اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے شرابی رفیقوں کی دست درازی سے ملائم ان کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا　　علی رسلہا مطروقۃ لم تشدد

جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ ناز کے ساتھ آگے بڑھتی ہے

وما زال تشرابی الخمور ولذتی　　وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار ہے

ولولا ثلث ہن من عیشۃ الفتی　　وجدک لم احفل متی قام عودی

اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف زندگی ہیں تو میری قسم، میں اپنی موت کی پرواہ نہ کرتا

فمنہن سبقی العاذلات بشربۃ　　کمیت متی ما تعل بالماء تزبد

ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کئے بغیر سرخ و سیاہ رنگ شراب کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آ جائے۔

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب　　ببہکنۃ تحت الخباء المعمد

اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں بسر کرتا ہے۔

کریم یروی نفسہ فی حیاتہ　　ستعلم ان متنا غداً اینا الصدی

میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کر سیراب کرتا ہے موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔

وبرک ہجود قد اثارت مخافتی　　بوادیہا امشی بعضب مجرد

اور کتنے بیٹھے ہوئے سوتے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو ڈرایا جب میں ننگی تلوار لے کر چلا۔

فمرت کہاۃ ذات خیف جلالۃ　　عقیلۃ شیخ کالوبیل یلندد

تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی جو لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا قیمتی چیز تھی، سامنے آئی۔

وقال الا ماذا ترون بشارب　　شدید علینا بغیہ متعمد

(اور جب میں نے تلوار سے کونچ کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا) تو اس بڈھے نے کہا اس بدمست کو دیکھو جو ہم پر جوش کر ظلم کر

رہا ہے۔

فظل الاماء یمتللن حوارہا　　ویسعی علینا بالسدیف المسرہد

تو لونڈیاں اس کے بچہ کو جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا بھونتی تھیں اور چربی اور کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جاتا تھا۔

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی کونسل کا چوتھا ممبر ہے کہتا ہے۔

بل انت لا تدرین کم من لیلة طلق لذیذ لهوها وندامها

بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔

قد بت سامرها وغایة تاجر وافیت اذ رفعت وعز مدامها

میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب فروش کی منزل میں آ جاتا تھا جب جھنڈا بلند ہوتا اور شراب کی قیمت گراں ہوتی۔

اغلی السباء بکل ادکن عاتق او جونة قدحت وفض ختامها

میں اس کی قیمت کو اور گراں کر دیتا تھا پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔

وصبوح صافیة وجذب کرینة بموتر تأتاله ابهامها

اور صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا بربط کو کھینچنا کہ اسے انگوٹھے سے بجاتا۔

باکرت حاجتها الدجاج بسحرة لاعل منها حین هب نیامها

میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر سے پہلے پوری کی تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دوبارہ پیوں۔

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انھیں عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے قصیدے میں کہتا ہے

الا هبی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

ہاں اپنا پیالہ لے کر اٹھ اور ہم کو صبح کی شراب پلا اور اندرین (شامی گاؤں) کی کوئی شراب بچا نہ رکھ۔

مشعشعة کان الحص فیها اذا ما الماء خالطها سخینا

پانی ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔

تجور بذی اللبانة عن هواه اذا ما ذاقها حتی یلینا

غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے گی اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔

تری اللحز الشحیح اذا امرت علیه لماله فیها مهینا

تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا پیالہ دور کرا دیا جائے تو وہ اپنے روپیہ کو لٹا دے۔

صبنت الکاس عنا ام عمرو وکان الکاس مجراها الیمینا

اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کو دہنی طرف چلنا تھا۔

وما شر الثلاثة ام عمرو بصاحبک الذی لا تصبحینا

حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نے پلایا نہیں ان تینوں میں سب سے بدتر نہیں۔

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (نساء)
نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

ابو عبدالرحمٰن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور جلسہ نشہ میں قرأت بدل جانے والے کے نام میں اختلاف ہے ہم چند روایت کے اصلی الفاظ لکھتے ہیں، وہ روایتیں جن میں حضرت علیؓ کا نام ہے۔

١۔ عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمن بن عوف طعاما فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوة فقدمونی فقرات قل یایها الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون فانزل الله یا ایها الذین امنوا لا تقربوا الصلوة وانتم سکاری (ترمذی تفسیر نساء)

ابو جعفر رازی نے عطاء بن سائب سے عطاء نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے ابو عبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علیؓ بن ابی طالب سے روایت کی کہ انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو دعوت دی اور شراب پلائی جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے قل یایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون پڑھ دیا اس پر خدا نے یہ آیت اتاری یایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوة وانتم سکاری (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو)

٢۔ عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی رضی الله عنه ان رجلا من الانصار دعاه وعبدالرحمن بن عوف فسقاهما قبل ان تحرم الخمر فامهم علی فی المغرب۔

سفیان نے عطاء بن سائب سے عطاء نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے ابو عبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبدالرحمٰن بن عوف کو دعوت دی اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی پھر علیؓ نے نماز مغرب پڑھائی۔

٣۔ خالد بن عبدالله عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن ان عبدالرحمن صنع طعاما فدعا فقرا قل یایها الکافرون فخلط فیها فنزلت لا تقربوا الصلوة وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون۔ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

خالد بن عبداللہ عطاء بن سائب سے عطاء ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور اصحاب میں سے ایک نے امامت کی اور قل یایھا الکافرون پڑھی لیکن اس میں گڑبڑ کر دیا اس پر آیت اتری لا تقربوا الصلوة وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہو اس کو جان لو۔

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

شراب کا دور بھی چلا۔ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں۔ اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی

اس پر حکم آیا۔ (صحیح مسلم فضائل سعد بن ابی وقاص)

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (مائدہ)

اے ایمان والو! بے شبہ شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو کہ فلاح پاؤ۔

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہو گئی۔ حرمت شراب کی یہ آیت جس وقت اتری، حضرت ابو عبیدہؓ اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے ابو طلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انسؓ کی زبانی روایت ہے۔

﴿كنت أسقي أبا عبيدة وأبا طلحة وأبي بن كعب فجاءهم آت فقال إن الخمر حرمت﴾

میں ابو عبیدہ، ابی بن کعب اور ابو طلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے۔ لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا، خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا الآیہ۔ لیکن لوگوں نے کہا کہ خدا نے ہم پر حرام نہیں کی، صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قراءت میں خلط کر دیا۔ اس لئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے، البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا۔ پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ اب لوگوں نے کہا کہ خداوندا ہم باز آئے۔

اس میں حضرت علیؓ کا بھی ذکر نہیں۔ حضرت علیؓ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں۔ محدثین میں حاکم نے مستدرک میں پہلی روایت کو ذکر کر کے بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود علیؓ روایت فرماتے ہیں۔ حاکم کہتے ہیں

وفي هذا الحديث فائدة كثيرة وهي أن الخوارج تنسب هذا السكر وهذه القراءة إلى أمير المؤمنين علي بن أبي طالب دون غيره وقد برأه الله منها فإنه راوي هذا الحديث (مستدرک تفسیر نساء ج ۲ ص ۳۰۷)

اور اس حدیث میں بہت بڑا فائدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے نشہ اور اس غلط قراءت کو امیر المومنین علی بن ابی طالب ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا کیونکہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔

۱۔ در حقیقت واقعہ سے صرف راوی تھے لیکن بعض بعد کے راوی نے خود حضرت علیؓ کو صاحب واقعہ بنا دیا۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبل بھی شریک تھے اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ لوگوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے لیکن تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کی ممانعت کر دی کسی نے یہ پوچھا تک نہیں اور دفعتہً جام و سبو توڑ ڈالے یہ صرف ابو طلحہؓ کے گھر کا حال نہیں تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں۔

بخاری باب المظالم میں ہے۔

﴿فجرت فی سکک المدینة﴾

مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔

ان حدیثوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی:

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہو گیا تھا عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لئے جوا بھی انہیں کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے۔

اعیّرتنا البانها ولحومها　　وذلک عار یا ابن ریطة ظاهر

کیا تم ہم پر عیب لگاتے ہو کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں اے ابن ریطہ تم پر یہ عیب تو نہیں لگ سکتا۔

نحابی بها اکفاءنا ونهینها　　ونشرب فی اثمانها ونقامر

ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو سماحی میں صرف کرتے ہیں ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لئے تھے جن کے نام یہ ہیں فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلی، منافس، منیح، سفیح، وغد ان میں ہر تیر کے مختلف حصے متعین کر لئے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جس کے نام پر نکلتے ان کو ناکامی ہوتی تھی اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہوتے تھے ان کو فقیروں محتاجوں اور دوستوں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لئے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو برم کا خطاب دے رکھا تھا[1] جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ مطبوعہ مجتبائی صفحہ ۱۳۳ روایت ابن عمر۔

تھے ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے۔

وإذا هلكت فلا تريدي عاجزا غسا ولا برما ولا معزالا

تو اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور، جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔

جوئے کی ایک صورت جس کو "رہان" کہتے تھے یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے، چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لئے چھ برس کی مدت مقرر کی چنانچہ جب یہ مدت گزر گئی اور رومیوں کو فتح و ظفر نصیب نہ ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بازی ہارنی پڑی[1] اور رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا ذوق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کو کھونے کے بعد بیوی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے[2] یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سود خوری

عرب میں سود خوری کا عام رواج تھا تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت ﷺ کے چچا تھے تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سود خوری میں نہایت شہرت رکھتے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان ہی کے سود کو باطل قرار دیا حضرت عثمانؓ اور خالد بن ولیدؓ سود پر قرض دیتے تھے مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل، حبیب، ربیعہ نہایت دولت مند تھے۔ مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[3]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (بقرہ)

مسلمانو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لئے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خوری نہ کریں

---

۱ یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۳۱ میں ہے۔

۲ ترمذی میں ہے جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک حرام نہیں ہوئی تھی۔

۳ تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۰

گئے۔ [1] اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔ [2]

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے اور راس المال کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کر دیتے تھے، جب میعاد گزر جاتی تھی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو واپس نہ کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا لیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد معینہ کے لئے کسی کو مثلاً سو روپے دیتے تھے لیکن مدت گزر جاتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو واپس نہ کر سکتا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اسی طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی تھی، یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تمام حصہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (آل عمران)

مسلمانو! دونا چوگنا سود نہ کھاؤ اور خدا سے ڈرو یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اگر راہن میعاد معینہ پر مال مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا [3] مال و دولت سے گزر کر عورتوں اور بال بچوں تک کو رہن رکھوا لیتے۔ [4]

لوٹ مار:

عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو قتل و غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے تھے جنھوں نے راہزنی کو اپنا ذریعہ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا اس قسم کے لوگوں کو "لصوص" کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں جنگلوں میں، پہاڑ کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قافلے گزرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا ان کا استیصال صرف ایک پر زور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ "وہ دن آنے کو ہے کہ جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضرموت کا سفر کرے گی" چونکہ وہ قبیلہ طے کے رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لئے ان کو تعجب ہوا کہ طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے؟

---

1. فتوح البلدان بلاذری فتح طائف۔
2. ابو داؤد کتاب الامارت۔
3. موطا امام مالک ص ۲۹۳۔
4. بخاری قتل کعب بن اشرف۔

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل و عیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان میں سے بسلامت نہیں گزر سکتے تھے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا چونکہ صبح کا وقت جبکہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صبح کا لفظ عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور پر بولا جاتا تھا کامیاب ڈاکو، اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے۔

یا لهف زیابة للحارث الصابح فالغانم فالآیب

اے زیابہ افسوس حارث کے لئے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشے سے باز رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پا کر اسی طرح تصرف کرتا تھا اس لئے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اسی طرح ملک میں مستقل قتل و غارت، اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری:

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج عام تھا مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرا شہرت عام رکھتے تھے تابط شرا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور عیاری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا تھا اس لئے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنہوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا[1] بلکہ اس کے لئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔[2]

عام بدو عربوں میں یہ برائی جس قدر عام ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے دوسری باتوں کے ساتھ ان سے یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ "وہ آئندہ چوری نہ کریں گے"[3] بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کے معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔[4]

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کرتے تھے ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک پیچ لگا لیا

---

۱ صحیح بخاری جلد ص ۷۰۰۔

۲ کتاب المعارف ابن قتیبہ۔

۳ صحیح بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۳۔

۴ سورۂ ممتحنہ رکوع ۲۔

سفاکی و بے رحمی و وحشت:

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے زندہ اونٹ اور دنبے کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے لڑائیوں میں مقتولوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیتے۔ اس کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے۔ اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔

کبھی کبھی آدمی کو کسی کوٹھڑی میں قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا اس طریقہ سزا کا نام ان کے ہاں "صبر" تھا مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردہ کی سواری بنے گا اس اونٹ کو "بلیہ" کہتے تھے۔

زنا اور فواحش:

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کیے جاتے تھے امراؤ القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا اس کے ساتھ شہزادہ اور والی ملک تھا۔ اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور دوسری عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں باوجود اس کے اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچے بچے کی زبان پر تھے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت علانیہ زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپ چھپا کر کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں [1] قحبہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں گاڑ کر بیٹھتی تھیں [2] اور صاحب رایات کہلاتی تھیں ان کی اولاد اصلی و حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں ان میں سے ایک کا نام عناق تھا۔ مرثد غنوی نے آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کر لوں اس پر یہ آیت اتری۔

﴿ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ﴾ (نور)

اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔

---

1. تفسیر طبری جلد ۸ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۳۔
2. صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ ص ۷۶۹۔

بڑے بڑے معزز ساہوکار اپنی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے روپیہ کما کر لائیں اور ان کی قدر کریں۔ عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے۔ عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا امیمہ تھا وہ ان دونوں کو زنا کاری کرانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔ ۱؎

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ﴾ (سورۂ نور)

اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی تھی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سربازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت معینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چند روز باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی:

شرم و حیا کا وجود نہ تھا حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے تھے لیکن (قریش کے سوا) باقی سب مادرزاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے عورتیں جب ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا پھر یہ شعر پڑھتیں۔

الیوم یبدو بعضه او كله — آج بدن کا کچھ حصہ یا سارا ننگا ہے اس سے

فما بدا منه فلا احله — لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

۱؎ ابوداؤد کتاب النکاح و صحیح مسلم باب التفسیر۔

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے۔ باپ مرجاتا تو اس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں) بیٹے کے تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں بن جاتیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جاتے، خوشبو وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی۔ اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی، وہ مینگنی کو پھینک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیم حالت قائم ہوتی[1] عورت کا جو مہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کی ہمدردی کی مستحق تھی رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا۔

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾ (نحل۔ ۸)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کر لے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔

ابو حمزہ ایک شخص تھا اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی۔

ما لابی حمزۃ لا یاتینا	ابو حمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا۔
یظل فی البیت الذی یلینا	اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔
غضبان ان لا نلد البنینا	اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے۔
تاللہ ما ذالک فی ایدینا	خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔
ونحن کالارض لزارعینا	ہم بطور کھیت کے ہیں۔
ننبت ما قد زرعوہ فینا	ہم میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی، لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر گڑھا کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے اس کو عربی میں وأد کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں

---

1. ابو داؤد کتاب النکاح باب احداد المتوفی عنہا زوجہا۔
2. تفسیر ابن جریر و ابن کثیر سورۂ اذا الشمس کورت۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیتیں بھی تھیں جو دنیا میں صرف انہیں کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی ایسی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خالق فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعت خاص سے سرفراز کیا۔

صحت نسب:

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی نجابت نسبی ہے شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی ہمت نہیں کی، توراۃ نے حضرت ابراہیمؑ کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے چنانچہ ریورنڈ فارسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی تعبیر متعین کی ہیں [1] قدیم یہودی مورخ جوسیفس نے بھی یہی لکھا ہے اور آج کل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں [2] اور بعض اور لوگوں کے متعلق عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لئے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے [3] اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا۔

﴿ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ﴾ (حج)

تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

حضرت ابراہیمؑ تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو توراۃ میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل و عیال کی نظر آتی ہے اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے وہی خیمے ہیں وہی صحرا ہیں وہی مویشی ہیں وہی بدویانہ زندگی ہے وہی رسوم و رواج ہیں جن کو اسلام نے آ کر اور زیادہ نکھارا وہی ختنہ ہے وہی حج اور قربانی کی عبادتیں ہیں اور یہ اتنا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ ایک مشہور جرمن محقق نولڈیکی کہتا ہے:

---

1. ترجمہ انگریزی ۱۸۴۴ء جلد اول ص ۱۴۵
2. تاریخ الیہود فی بلاد العرب اسرائیل ولفنسون مطبوعہ مصر ۱۹۲۷ء صفحہ ۷۴
3. سینٹ پال گلتیوں کے نام باب ۴-۲۵

محکوم نہ تھے:

عرب کا ملک تخلیق عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی۔ بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و زبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی۔ عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران اور روم کی سرحد پر واقع تھا مگر دونوں اپنے عروج میں آ کر بھی اس کی طرف بڑھنے سے قاصر رہیں۔ صرف عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کی جمعیت کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی مگر قدرت الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا، یہ تمام اہتمام و انتظام اسی لئے تھا کہ کوئی دوسری بیرونی قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد برباد نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار رہے، ان کی فطری طاقت بدستور قائم رہے تا کہ یہ کل خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقاء میں کام آئے۔

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے:

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفہ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ دورنگی اور کتابی ذہنیت سے پاک تھے وہ اسی لئے تھے تا کہ ایک امی معلم کی روحانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں۔

روئے زمین کے وسط میں آباد تھے:

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے پھر بحری جانب سے قدرت نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا اس لئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف سے تمام جزائر، افریقہ، حبشہ، زنجبار، ادھر جزائر ہند، جاوا، سماٹرا اور چین تک ان کا گزر ہوا اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا۔ یہ تمام مواقع اس لئے میسر آئے کہ عرب کی جائے وقوع اس دعوت کے لئے مناسب مرکز تھا فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برابر طور سے ایک ساتھ توڑنے کے لئے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا آسانی ممکن ہوا۔

بعض اخلاقی خوبیاں:

ان کے علاوہ اہل عرب کو پیغمبر اسلام بننے اور عالم کے لئے شاہد امت اور معلم بننے کے لئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں

کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علمبردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے:

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے وہ خطرات سے بے خوف تھے اور لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ و قیصر کو انھوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پرجوش تھے:

ساتھ ہی وہ پرجوش بھی تھے اس لئے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لئے بحر و بر دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزم و ارادہ سے ارکان عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے:

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری نے ان کو دل کا شجاع اور بہادر بھی بنا دیا تھا جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر بھی ہوتی تھی، مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی۔ یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے:

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیہ عقل و دانش سے وہ کافی طور بہرہ مند تھے حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، خالد بن ولیدؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ نے طرز تمدن، اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انھوں نے معاملات و مراسلات و مکاتبات کو سرانجام کیا اور علوم و سیاست کے الجھے ہوئے مسئلوں کو جس طرح سمجھایا وہ خود اس نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے ان کے شعراء کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں ان کے فصحاء کے مقولے سنئے تو ان کی اس فطری صلاحیت کا اندازہ ہو گا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لوگ وہ کچھ دے گئے جو اپنے دور سے آگے تھے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے:

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر جسم کے بعض قویٰ بیکار رہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قویٰ کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت

صبح سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اس ظلمت میں تھی کہ صبح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا۔ ظلمت شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ادھر وہ سورج کی کرنوں سے پرنور ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا، اس لئے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب:

سرور کائنات ﷺ کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا اور اسی بناء پر ایک ایسی شریعت کامل عطا کی تھی جو نہ صرف عربوں بلکہ تمام عالم کے لئے ابد تک کافی ہے، لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی مکمل تصویر ہو، وہ جس کی ہر بات ہر ادا ہر جنبش عملی خطیب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنا لے۔

اس بناء پر خاتم انبیاء ﷺ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لئے تیار کرنا تھا۔ دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار اور ذلیل ہے ﴿وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (ہم نے تم کو دنیا کی قوموں پر فضیلت دی) [1] کا تاج پہن چکی تھی لیکن اوپر بہ تفصیل گزر چکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ نشوونما سے لبریز تھا اور ایک لوح سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا۔ مشیت ایزدی نے اسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل سرتاپا وحشت اور سرتاپا بدعملی بن چکا تھا ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ کا مظہر بن گیا۔ [2]

ان لوگوں کا حلیہ جمال اور خط و خال یہ تھا۔

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہوتا ہے وہ منجملہ ان اصول کے جو مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔

بان يدعو قوما الى السنة الراشدة ويزكيهم ويصلح شأنهم ثم يتخذهم بمنزلة جوارحه فيجاهد اهل الارض ويفرقهم على الآفاق وهو قوله تعالى كنتم خير امة اخرجت للناس۔

وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے پھر ان کو اپنے دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور انہی کے ذریعہ سے جہاد کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا کہ تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

[2] ترجمہ: تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا ہوئے ہو تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (حج۔ ۴۱)

وہ لوگ کہ ہم جب ان کو دنیا میں اقتدار دیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

اصلاح وہدایت کی مشکلات:

ہر قوم کی اصلاح وہدایت میں اس سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن عرب کی اصلاح میں جو تھیں وہ بہ حیثیت ہر جہت کی گوناگوں اور لا علاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا، بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان ان کے سر سے گذر چکا تھا حضرت موسیٰؑ نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجہ ستم سے ان کو چھڑا کر نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر دنائت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لو اور اس پر حق سلطنت بٹھاؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ یہ ایک اخلاق و معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر معدوم نہیں ہوگئی بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت:

عرب کی قوم امی محض تھی الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادات ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی قرآن مجید نے ان کے اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے۔

﴿يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ (یٰسین۔ ۱)

قرآن حکیم کی قسم تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے، راہ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے جن کے باپ دادا کو ڈرایا نہیں گیا اور اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام مسائل سے محض بیگانہ تھی۔

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ﴾ (ص۔ ۱)

اور انہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ ساحر ہے جھوٹا، کیا اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے پنچ اٹھ کر یہ کہتے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو اس میں اس کی کچھ غرض ہے، ہم نے یہ پچھلے مذہب میں نہیں سنا، یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔

﴿ بَلْ عَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾ (ق-۲)

بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔

صفات ذاتی، آثار نبوت، احوال معاد، ان میں سے ہر بات کو ان کا ذہن کسی طرح مانتا نہ تھا، حیرت میں پڑ جاتے تھے، نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں، اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیے تھا۔

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (فرقان-۲۱)

اور جو لوگ ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔

﴿ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ (فصلت-۱۴)

پیغمبر جب ان کے سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا، ہم تو تمہاری باتوں کا انکار کریں گے۔

﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل)

ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

نبی کا تخیل ان کے ذہن میں کچھ آتا تھا تو بشریت سے بالاتر صورت میں، یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو، اس کے پیچھے خدا کا اور فرشتوں کا پہرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں۔

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ﴾ (بنی اسرائیل-۹۰-۹۳)

انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے ہمارے لئے ایک چشمہ نہ بہا دو، یا تمہاری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو جس میں تم نہریں جاری کر دو، یا جیسا کہ تم نے کہا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو، یا خدا اور فرشتوں کو ہمارا کفیل بنا کر لے آؤ، یا تمہارے پاس کوئی سونے کا گھر ہو، یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ۔

﴿ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ﴾ (فرقان-۷-۸)

قبائل کا بھی یہی حال تھا۔ مشرکین کلام الٰہی کا جواب خود تفسیر سے دیتے تھے اور سوز نبوت سے ان کا چشم پرنم اور دل پر کیف تھے

﴿ إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ﴾ (بنی اسرائیل)

جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، آج ہے کہ پیغمبر آخر الزمان کے بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا اور گریہ و زاری کرتے ہوئے منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔

﴿ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴾ (مائدہ)

ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، سبب یہ ہے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترا ہے تو ان کی آنکھوں کو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے ہم کو بھی حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اسی بنا پر اسلام کے مقابلہ میں اپنی زبان سے اپنی دلی باطنی کا اظہار وہ ناجائز سمجھتے تھے تاہم چشم و دل کو بینش حق سے بند نہیں رکھ سکتے تھے۔

﴿ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ (بقرہ۔ ۱۷)

جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔

﴿ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ﴾ (بقرہ۔ ۱۱)

اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ مجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا کانوں کا جویاں تھا، حضرت سعید بن زیدؓ، عثمان بن مظعونؓ، صہیب رومیؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں اسی قسم کے لوگ تھے، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین و کفار خدا کا کلام برسوں تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی سختی میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریشی عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور داعی کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک

رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کئے وہ یہ تھے "اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے ہم کو بے وقوف اور نادان سمجھتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ سمجھتا ہے یا تو تم ان کو روکو یا ہم کو اور ان کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔"

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا ابوطالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا "اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی برائی اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی تحقیر نہیں سن سکتے تو یا تو اس کو باز رکھو ورنہ ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ۔" اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں "اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو جوان ہے تم اس کو متبنی بنالو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لئے ہمارے حوالے کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کیا ہے اور ان کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے۔" سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرت ﷺ سے مل کر گفتگو کی اور کہا "اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو جو تم لائے ہو تم نے باپ دادوں کو برا کہا ہمارے مذہب کی تحقیر کی دیوتاؤں کو گالی دی ہم کو بے وقوف اور نادان بتایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا غرض کوئی ایسی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔"[1]

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو معلوم ہوگا کہ آبائی دین موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی شان سے آزاد ہونا ان پر کتنا بار تھا اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے موسم حج میں آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لئے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا کہ "لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔"[2]

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی حمایت کی اور وہ آپ کو اپنے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے آبائی دین کے مقابلہ پر پذیرائی کے قابل نہ سمجھتے تھے بھتیجے نے بار بار کہا "چچا جان! کلمہ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے۔" ابوطالب نے جواب دیا "جان پدر! سب کچھ منظور ہے لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔" عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "چچا جان لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے پاس آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔" ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا "ابوطالب کیا تم اپنے باپ عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔" آپ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ "میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں" اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔[3] صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ "اے

[1] یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں تفصیل مذکور ہیں۔

[2] مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان۔

[3] کتاب الجنائز باب اذا قال المشرک عند الموت لا الہ الا اللہ۔

بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا ہو لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا" [۱]
ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ سے وہ فقرہ کہہ دیا [۲] بہر حال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی جانشین کے پاس باز رکھنے کے لئے اس سے زیادہ پرزور اور پراثر دلیل نہ تھی کہ "ابوطالب کیا آبائی مذہب چھوڑ دو گے؟" اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

توہم پرستی:

عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر زبان سے کچھ نکلا تو فوراً بلائیں آ کر ہم کو لپٹ جائیں گی، عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام انہیں اصنام اور بتوں سے متعلق کیے جاتے تھے، مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گذاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا فرزند نرینہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بناء پر اسلام کے نام سے ان کو ڈر وآتا تھا اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا:

﴿ إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ﴾ (ہود)
ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو آسیب پہنچایا ہے۔

ابتداء میں جب آنحضرت ﷺ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا [۳] جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے [۴] ضمام بن ثعلبہ ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات و عزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ "ضمام! ان کو برا نہ کہو، دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے" [۵] حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں، کفار نے کہنا شروع کیا لات و عزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے [۶] حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا "دیکھو ذو الشریٰ (بت) کہیں برباد نہ کر دے"۔ [۷]

فتح مکہ کے بعد جبکہ دیوتاؤں کے زور و قوت کا راز افشاء ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان باب ۹۔
[۲] ابن ہشام وفات ابی طالب۔
[۳] ابن کثیر، زمخشری، ابن حیان، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے۔
[۴] دیکھو تفسیر آیت مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وکذا بصاحبهم من جنة صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ
[۵] مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ۔
[۶] اسد الغابہ ترجمہ حضرت زنیرہؓ و سیرۃ ابن ہشام ذکر مستضعفین مسلمین۔
[۷] اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمرو دوسی۔

ہوتے تھے چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آ کر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے[1] اسی طرح ایک بدو نے آ کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن سوء اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فسخ کرا دی اور فرمایا:[2]

﴿المدینۃ کالکیر تنفی خبثہا و تنصع طیبہا﴾

مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے۔

انہی اسباب کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے مدینے کے متعلق یہ دعا فرمائی۔

﴿اللہم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکۃ او اشد، اللہم و صححہا و بارک لنا فی مدہا وصاعہا وانقل حماہا فاجعلہا بالجحفۃ﴾[3]

خداوند! مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنا دے اس کو امراض سے صحیح کر دے اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔

قبائل کی خانہ جنگیاں:

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں۔ یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستقل اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا مٹانا قریباً محال تھا انہی لڑائیوں نے ثار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لئے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح ادا ہوتے چلے آتے تھے جو ورثہ در ورثہ منتقل ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے جو الفاظ سنتا تھا وہ یہ تھے کہ فلاں خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے اس لئے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا۔

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لئے ہاشم کا گھرانا چن لیا تھا بنو امیہ کی مخالفت اس کے لیے لازمی اصول تھی۔

مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر بجز حسن اخلاص پر مجبور تھا تو خزرج میں بہتیرے منافق تھے چنانچہ

---

1. صحیح بخاری کتاب المحاربین۔
2. بخاری ج ۱ ص ۲۵۲ کتاب الحج فضائل مدینہ باب المدینۃ تنفی الخبث۔
3. صحیح بخاری ہجرۃ النبی ﷺ الی المدینہ۔

یہ سماں تھا کہ اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی ہوا کیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کا دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔ ۱

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی مدینہ آنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو کہ انصار اسلام لا کر بہت تیزی کاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے لیکن عار کے جذبات کس طرح آسانی سے وقتاً مشتعل ہو جاتے تھے ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا تو انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) کی تلواریں میان سے نکل آئیں ۲ اور بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہؓ کے واقعہ افک میں جب آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اگر وہ تہمت لگانے والا ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن مار دیتا ہوں اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں ہم بجا لائیں گا اس پر سعد بن عبادہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے وفعتہً کھڑے ہو گئے اور کہا۔

﴿ كذبت لعمر الله لا تقتله ولا تقدر على قتله ولو كان من رهطك ما احببت ان يقتل ﴾ ۳

خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو اس کو قتل نہ کر سکے گا نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلے کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے چنانچہ بخاری کی حدیث افک میں ہے۔

﴿ فثار الحيان الاوس والخزرج حتى هموا ان يقتتلوا و رسول الله قائم على المنبر ﴾

یعنی دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت و خون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا قبائل کے تعلقات کی بناء پر عیینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی اور بہت بڑی اور سخت شور و شغب ہوا تو آپ نے عیینہ سے فرمایا "دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے" اس نے کہا "خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستا لوں جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے" اس پر شور و غل ہوا۔ آپ نے پھر یہی الفاظ دہرائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل

۱ ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔

۲ صحیح مسلم مع شرح نووی جلد ۲ صفحہ ۳۷۷ میں بھی ایک دوسری قسم کا واقعہ مذکور ہے۔

۳ صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک۔

کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تھا اس لئے قبیلہ بنو لیث کے ایک شخص نے جو مسلح گزرا تھا کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو دوسرا بدک کے بھاگ گیا یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے اس لئے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا' لیکن آنحضرت ﷺ چونکہ سفر میں تھے اس لئے دیت میں ۵۰ اونٹ اسی وقت دیئے اور مدینہ پہنچ کر ۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔ [1]

اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی' دو رکوع ادا کو سیان چن کر لینے کا حکم دیا تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا رہا تھا اس نے زمانہ جاہلیت میں قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا وہ لوگ انتقام کے لئے اس کی ٹوہ میں رہتے تھے سو اتفاق سے وہ مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ بارگاہ نبوت میں وہ پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے ان لوگوں نے حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے سفارش کی درخواست کی آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

"خدا نے مکہ کو دار الحرام بنایا ہے آدمیوں نے نہیں بنایا ہے خدا نے کل چند گھنٹوں کے لئے اس کو میرے لئے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت عود کر آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا' دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا' تیسرا وہ جس نے زمانہ جاہلیت کا انتقام لیا' تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا"

چنانچہ آپ نے اس کی دیت [2] ادا فرمائی۔

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں بنی حارث بن خزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا بنو ثعلبہ اسلام لا کر جب مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے ایک انصاری نے پکار کر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوایئے آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا ﴿ لا لا یجنی والد علی ولدہ ﴾ کہ بیٹے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔ [3]

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ تمام قبائل رقیب اور حریف مقابل تھے وہ مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی

---

۱ ابو داؤد جلد ۲ ص ۱۵۵ کتاب الدیات۔

۲ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۳۱۔

۳ دار قطنی ج ۲ ص ۲۰۸۔

سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھ کو کاشتکاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔[1]

خوب غور سے دیکھو بدر، احد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کرتا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے مثلاً غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہل مکہ ہی کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف وہم عہد تھے خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر انہی یہودیوں کے زیر بار تھے انہی سے قرض دام لیتے تھے انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے۔[2] خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے باہم حلیف تھے اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلہ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاہ اعظم تھا ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لئے آتا تھا اور آستانہ کعبہ پر سر جھکاتا تھا کعبہ کے مجاور معمولی چندہ دینے تھے بلکہ خیمہ و خرگاہ، تیغ و سپر، جاہ و حشم غرض ریاست و امارت کے تمام تر سروسامان رکھتے تھے اس لئے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اسلام چین سے نہیں بیٹھ سکا لیکن اسلام کی مخالفت صرف قریش کی متابعت پر محدود نہ تھی بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہ راست وہی تمام رؤسائے قبائل کو پہنچتا تھا، عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا اور مال غنیمت سے چوتھا حصہ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آجاتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام صفی تھا، یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا قبیلہ کے تمام معاملات ذاتی نزاعیں قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے یہ رؤساء عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔

قبائل میں یہی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لئے ایک کے بدلہ میں دو کو قتل کرتے تھے۔ یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوہ بدر میں قریش کی فوج سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بناء پر ان کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندان غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آگئی جبلہ نے اس کی گال پر تھپڑ کھینچ مارا اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمرؓ نے واقعہ سن کر کہا اس کا کیا قصور تم نے جو کیا اس کی جزا پائی جبلہ نے کہا یہ میرا رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا جو مذہب شرفاء کو ذلیل کر دیتا ہے میں اس سے باز آتا ہوں۔ یہ کہہ کر چوری سے

[1] ابن ہشام حصہ اول ص ۹۰۰ مطبوعہ مصر طبع اول۔

[2] طبری واقعہ خیبر۔

منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلے سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہوگئی اور حفظ ماتقدم کے لئے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا۔

﴿ اما الاسلام فاقبل و اما المال فلست منه فی شئی ﴾

اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔

ایک نکتہ یہاں خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ ''چوری نہ کریں گے'' اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا ورنہ آج اگر شرفاء سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا اس لئے عرب کو اسلام قبول کرتے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں' وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے' کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے' کسی کا مال نہیں چھین سکتے تو اب ان کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے وہ شہری متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا' قریش کا ذریعہ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر لئے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف اور مقابل تھے اس بناء پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو یہ دفعۃً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (صفحہ ۱۳۸ جلد ۳) میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے ہیں۔

﴿ قال الشافعی کانت قریش تنتاب الشام انتیاباً کثیرا و کان کثیر من معاشها منه وتاتی العراق فیقال لما دخلت فی الاسلام ذکرت للنبی ﷺ خوفها من انقطاع معاشها بالتجارة من الشام والعراق اذا فارقت الکفر و دخلت فی الاسلام و خلاف ملك الشام والعراق لاهل الاسلام فقال النبی صلی الله علیه وسلم اذا هلك کسری فلا کسری بعده فلم یبق بارض العراق کسری یثبت له امر بعده وقال اذا هلك قیصر فلا قیصر فاجابهم علی ماقالوا ﴾

امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائے تو پھر اس کے

بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آپ نے فرمایا جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہ ہوا جس کی وہاں حکومت ہو اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔

رفع شک:

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے' اہل مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کے خواہش ہائے نفسانی کے پورے کرنے کا سامان موجود تھا عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا' عرب سخت نفس پرست تھے اسلام نے چار بیویوں اور غیر محدود لونڈیوں کی اجازت دے دی' اہل عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی' اب کیا چیز تھی جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے جہاد اور تعدد ازدواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعدد ازدواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا جہاد صرف کافروں سے جائز تھا' فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی' تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے جہاد کے لئے اور بہت سی پابندیاں تھیں' جو پہلے بالکل نہ تھیں جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے' دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھی ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے پہلے نکاح کے لئے تعداد کی کوئی قید نہ تھی ایک ساتھ آٹھ آٹھ' دس دس شادیاں کرتے تھے اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے اس لئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا تمام تر غلط ہے برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایات قدیمہ' جہالت' عادات' رسوم' نفس پرستی' ہر چیز اسلام کے قبول کرنے کی مانع تھی۔

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہوتی ہے' وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں' آج یورپ علوم و فنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے' لیکن جو بے ہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں' اب بھی قائم ہیں' یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں' اسلام ایک ایک کا دشمن تھا' ثار یعنی انتقام خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا' اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا' خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی کی روح تھی' فنا کر دی گئی' ابو سفیان رئیس العرب کو بلال" (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا' یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں کے (زید و سالم وغیرہ) گھر میں آ گئیں' علاوہ

وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے سرد پڑ گئے۔

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام تر مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریح طبع کا کوئی سامان نہ تھا اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی وقت نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی۔

﴿ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴾ (بقرہ)

اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا' زکوٰۃ ایسا ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہوگئی' صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا' لیکن اب وہ حج جاہلیت کا حج نہیں رہا' طواف عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی' بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیئے گئے مقام منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا اسی کے ساتھ محرکات اور نواہی کی وہ عالم گیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی' زنا حرام' شراب حرام' قمار حرام' سونا چاندی حرام' اطلس وحریر حرام' چنگ وعود حرام' تصویر حرام' پھر زندہ دلی اور لطف زندگی کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو تمام مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے' پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے' ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفریب بت ہوتے تھے لیکن اسلام میں بظاہر دل آویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بناء پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا

پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے؟

تبلیغ نبوی

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گزشتہ سوانح موافق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے لیکن کارلائل کے بقول پہلے اور یہ بتاؤ اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس کے ذریعے سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضۂ تبلیغ:

"تبلیغ" کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ (انذار) ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں دوسرا لفظ دعوۃ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تذکیر جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں بعثت نبوی کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے وہ ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بودھ مت۔ باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے جو تبلیغی نہیں تھے جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندو مت۔ جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیروؤں کا عمل کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعلیم کی دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں۔ تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیئے اور اس کے داعی و حامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس سمجھتی ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح سے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی ۱۵) یا یونانی (مرقس) عورت نے برکت چاہی تو فرمایا "میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (متی ۱۵-۲۴) پھر فرمایا "مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں" (۲۶) پھر فرمایا "غیر قوموں

---

۱ [illegible] (ﷺ)

کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے ہوئے منادی کرنا۔" (متی۔۱۰-۶) پھر ارشاد فرمایا "وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو" (متی۔۷-۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ کتے اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت:

آنحضرت ﷺ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اس لئے اپنی تبلیغ کے لئے قریش و غیر قریش، حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ ابتدائی وحی میں انسانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ (مدثر۔۱) اے چادر پوش! تو کھڑا ہو اور ہشیار و آگاہ کر۔ پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا ﴿فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ﴾ (شوریٰ) لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا ﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾ (اعلیٰ) لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (ق) قرآن سے سمجھا اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔ اور ان کے علاوہ سینکڑوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی۔ حضرت علی سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بڑھ کر ہے۔ [1]

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے ہر پیرو پیغمبر کی دعوت امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔ آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیام الٰہی لوگوں تک پہنچا دیجئے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہ دیا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (مائدہ)

اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے، اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچا لے گا۔

اس کی وسعت:

اس کے بعد اس فریضہ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے۔ پیغام الٰہی سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ

---

[1] صحیح مسلم باب خیبر۔

قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے آنحضرت ﷺ کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا۔

﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴾ (شعراء۔۱۱)

اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ و ہوشیار کر۔

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے

﴿ لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ (شوریٰ۔۱)

تا کہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس کے بدوی ہیں ان کو آگاہ و ہوشیار کرے۔

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ احساس و عقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہیں۔

﴿ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ۝ لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا ﴾ (یٰسین۔۵)

یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تا کہ وہ اس کو ہوشیار کرے جو زندہ ہے۔

پھر جس تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے۔

﴿ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ﴾ (انعام۔۲)

تا کہ میں تمہیں آگاہ و ہوشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ و ہوشیار کرنے والی آواز پہنچے۔

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہے۔

﴿ هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (ابراہیم۔۷)

یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے۔

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا۔

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ﴾ (سبا۔۳)

اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ہوشیار کرنے والا بنا کر بھیجا۔

آپ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں۔

﴿ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ﴾ (اعراف۔۲۰)

اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت تبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے فرمایا۔

﴿ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (فرقان۔۱)

برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ محمد پر نازل کی تا کہ وہ دنیا جہان

کے لئے ہوشیار و آگاہ کرنے والا ہو وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری بھی اس وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی۔

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴾ (ص۔۵)

یہ قرآن تو دنیا کے لئے نصیحت ہے اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔

انبیاء اور بانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا' حضرت عیسٰیؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا' حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کو جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاش حق کے لئے آپ کے پاس مدینہ منورہ آئے تو قریش کو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدراہ بنے رہے پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لئے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پرامن آزادی ملے' چھ برس کے جنگ وجدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی' قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو "فتح مبین" قرار دیا اور ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾[1] نازل ہوئی' اس کے بعد ہی عرب اور بیرون عرب میں اسلام کے واعظ قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم' ایران اور حبش اور روم کے طالبین اسلام آئے اور فیضان حق سے سیراب ہوئے' مشرکین عرب' یہود اور عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

لیکن محض تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول:

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہئے' دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کے دعوے رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لئے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفہ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغام الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (نحل۔۱۶)

اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق

---

[1] صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ۔

اعراض اور قول بلیغ:

آنحضرت ﷺ کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے یہ حکم ہوتا ہے

﴿ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴾ (نساء)

تو ان سے درگزر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں: اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بدسلیقگی، بدتمیزی اور درشتی سے اغماض و درگزر اور ان کو برداشت کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہئے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہئے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر:

انہیں ربانی ہدایتوں کی تعلیم میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی ﴿ يسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا ﴾[1] دین الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا۔ یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اس اصول کے مطابق دین الٰہی پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت، درشت اور مشکل نہ بنانا تو اس کے قبول عام کی راہ ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پر امید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج:

تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کئے جائیں۔ پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہئے اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی الاہم فالاہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، پھر زکوٰۃ ہے، پھر دوسرے فرائض ہیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے فرمایا "تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد اس کا رسول ہے جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے، یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دیا جائے، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بہتر مال کو نہ لینا اور اہل مظلوم کی

---

۱ صحیح بخاری بعث معاذ الی الیمن جلد ۲ صفحہ ۶۲۳۔

ہو جانے سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔[1]

تالیفِ قلب:

تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جس کو تالیفِ قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ﴿وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ﴾ (توبہ-۸) اس کے لفظی معنی ہیں "دلوں کو ملانا" اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو لطف و محبت اور امداد و اعانت اور غمخواری و ہمدردی کرنا ہے کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اسی انداز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حنین کی غنیمت کا سارا مال انہیں کو تقسیم کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں۔ صفوان جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت ﷺ سے نہایت بغض رکھتے تھے وہ کہتے ہیں کہ "مجھ کو آنحضرت ﷺ نے دیا جتنا دیا، اور مجھے آپ سے سخت بغض تھا لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری یہ حالت ہے کہ آپ سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔"[2] ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریاں جو چرتی پھر رہی ہیں وہ مجھ کو عنایت کیجئے آپ نے وہ سب اس کو دے دیں۔ اس فیاضی کو دیکھ کر اس پر اتنا اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ کو آ کر کہا "بھائیو! اسلام قبول کرو کیونکہ محمد اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا۔"[3]

ایک یہودی لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے پھر فرمایا کہ "لڑکے اسلام قبول کر لے۔" اس نے منتظرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا اس نے کہا ابوالقاسم (آپ کی کنیت) کی بات مان لے۔ چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا اور جب آنحضرت ﷺ وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچا لیا۔[4]

دعوتِ عقل:

اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کیونکہ اس کے بغیر اس کے حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی بنا پر مذاہبِ عالم کی تاریخ میں نبوتِ محمدی سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے معجزات و خوارق (تورات) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راہبوں کے احکام (وید) کے بجائے عقلِ انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، دلیل و حجت کا مطالبہ کیا، اس نے اپنی ہر تعلیم کی خوبیاں، مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار عقل والوں کو آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت کی۔ فرمایا

---

۱ صحیح بخاری باب ذکر جلد دوم صفحہ ۲۶۰۔

۲ صحیح مسلم جلد دوم صفحہ ۲۵۳ مصر۔

۳ ایضاً۔

۴ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

﴿ قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ﴾ (انعام-۱۸)

کہہ دے کہ کیا تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو ہمارے لئے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تخمین ہی کرتے ہو، کہہ کہ خدا ہی کی ہے پہنچی ہوئی دلیل۔

نیز ارشاد ہوا

﴿ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ (انفال-۵)

تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا ہے وہ دلیل سے جئے اور خدا سننے والا جاننے والا

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا۔

﴿ وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ﴾ (یوسف-۱۲)

اور آسمانوں میں اور زمین میں خدا کی توحید کی کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گذر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔

غور و فکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا

﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا ﴾ (آل عمران-۲۰)

بیشک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار تو نے یہ عالم بیکار نہیں بنایا۔

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت کیا ہوگی مگر بہرحال یہ خارجی استدلال تھا اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی فرمایا

﴿ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴾ (ذاریات-۱)

اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں۔

صحیفہ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے

﴿ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ﴾ (ق-۱)

یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لئے۔

﴿ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ ﴾ (اعراف-۲۴)

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

﴿ هَٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ ﴾ (جاثیہ-۲)

یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں۔

﴿ افلا یتدبرون القرآن ﴾ (نساء۔ ۱۱)

کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔

﴿ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها ﴾ (محمد۔ ۳)

کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے ہیں۔

﴿ والقرآن الحکیم ﴾ (یٰسین۔ ۱)

حکمت والے قرآن کی قسم۔

﴿ تلک آیات الکتاب الحکیم ﴾ (یونس، لقمان)

یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا، سزا، عبادات، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، انفاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر شے کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں، آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی مثالیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں:

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ہوا اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے طریقہ کو جائز رکھ سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز کہ اسلام میں مذہب کا اصلی جز ایمان ہے، ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ جبر سے تو تلوار کی نوک بھی کسی کی لوح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔

﴿ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی ﴾ (بقرہ۔ ۳۴)

دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی۔

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی، دوسری جگہ فرمایا

﴿ وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر ﴾ (کہف)

اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔

ایمان و کفران دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور جو فہم اس سے محروم ہیں گے اس کے بعد یہ تصریح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا

کی آزادی حاصل کرنے کے لیے تھی جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں آگے آئے گا قرآن کی اس آیت میں۔

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ [انفال]

اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔

"فتنہ" سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمرؓ صحابی کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے ایک شخص نے آکر ان سے کہا کہ خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لئے لڑنے کا حکم نہیں دیا؟ اور یہی آیت پڑھی، انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت کے زمانہ میں ادا کر چکے ہیں جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا یا اس کو لوگ مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔[1]

میدان جنگ میں تبلیغ:

ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی غلط تعبیر کی ہے اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلے سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں اول یہ کہ تم بھی کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ اگر ایسا کرو تو تم دینی، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی اگر وہ ان دو میں سے کسی بات کو قبول کر لیں تو ان سے لڑنا ناجائز تھا، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خونریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سرتاپا امن پسندی، صلاحیت، صلح اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو ناواقفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی" آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ کسی فوج کو متعین کرتے تو اس کے سردار کو یہ ہدایت فرماتے۔

"جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو ان کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے ان میں سے جو بات بھی وہ مان لیں اس کو قبول کرلے اور ان پر حملہ کرنے سے رک جا، ان کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کر لیں تو پھر ان سے رک جا۔ ان سے فرمائش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائیں تو ان کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اگر وہ نہ مانیں تو ان کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی قانون ان پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فئی میں ان کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کریں اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ اگر وہ اس کو مان لیں تو ان سے بھی رک جا اور اگر وہ اس کو بھی نہ مانیں تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے۔"[2]

---

1 صحیح بخاری تفسیر انفال جلد دوم صفحہ ۶۷۰۔

2 صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

یہ وہ اصول جنگ تھے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی مجبور کو بزور شمشیر مسلمان بنایا جائے۔ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی۔ حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ "میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں، اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے مذہب ہی پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم ہو کر رہو گے۔"[1] اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہ بن اثال قبیلہ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا۔ ثمامہ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھمبے میں باندھ دیئے گئے۔ آنحضرت ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے؟ جواب دیا محمد میری رائے اچھی ہے اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا۔ آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا۔ پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا پھر تیسرے دن، تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ثمامہ کو چھوڑ دو" لوگوں نے کھول دیا اور رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے مگر رہائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی۔ مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر خود بخود غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔[2] کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے اس سے بہتر موقع ہو سکتا تھا جب کہ قیدی گرفتار ہو کر آتے تھے لیکن انہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام۔ اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا۔ قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا ﴿فاما منا بعد واما فداء﴾ یعنی لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، یہ ارشاد نہیں کہ اسلام یا تلوار۔

غزوہ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ آخر شیر خدا علی مرتضیٰؓ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جاؤ، وہ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں، فرمایا "آہستگی سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہو وہ ان کو بتاؤ۔ خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں۔"[3] چنانچہ خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا لیکن اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح کسی مسلمان کے لئے کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے۔ کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا، اس لئے لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے

---

۱ صحیح بخاری و سنن ترمذی ربط الاسیر۔

۲ صحیح بخاری غزوہ خیبر۔

۳ صحیح مسلم کتاب الایمان۔

اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لئے جھکے تو تو بھی جھک جا۔

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ﴾ (توبہ)

اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لئے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو مگر ایسا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ کر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی سے رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے۔

﴿فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا﴾ (نساء)

تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ "یا تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی اس صلح جوئی اور اس ترک جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی؟

مسلح تبلیغی جماعتیں:

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسر پیکار تھا راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا اس لئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو جاہلی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لئے مسلح جاتی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کی تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوہ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لئے ادھر ادھر بھیجا تب وہ بھی اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں واقعہ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بئر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریہ ابن ابی العوجاء میں پچاس مسلمانوں کی شہادت، واقعہ ذات اطلاح میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ

بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ ودعوت کی تنظیم:

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے تھے' بنفس نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس آ جاتے تھے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔ یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا' جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے یہاں آ جاتے تھے' آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے' اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے' مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ حبش کی طرف روانہ ہوئے' اس سفر کی مصلحت عجیب وغریب تھی' ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گذرے' اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبش دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوگئی۔

مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابوبکرؓ تھے' مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان انہیں کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ حضرت عثمانؓ' حضرت طلحہؓ' حضرت زبیرؓ' حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیرؓ تھے جن کے موثر وعظوں کو سن کر آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن واطمینان کی سانس لی تو آنحضرت ﷺ نے ان نومسلموں کو تعلیم کے لئے جو اطراف ملک سے دارالاسلام میں آتے تھے نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحاب صفہ (چبوترہ والے) مشہور ہے اس میں وقتاً فوقتاً سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے تھے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے' بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں' بادشاہوں' قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پہنچے احادیث وسیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے چھتیس صحابیوں کے نام جمع کئے ہیں جنہوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے اس فرض کو انجام دیا ان کے نام یہ ہیں ابوذر غفاری' طفیل بن عمرو دوسی' جعفر طیار' عمرو بن عبسہ سلمی' ضماد بن ثعلبہ' خالد بن ولید' علی بن ابی طالب' مہاجر بن ابی امیہ' زیاد بن لبید' خالد بن سعید' عدی بن حاتم' علاء بن حضرمی' ابوموسیٰ اشعری' معاذ بن جبل' جریر بن عبداللہ بجلی' دحیہ کلبی' عمرو بن امیہ ضمری' مغیرہ بن شعبہ' عمرو بن العاص' وبر بن یحنس' عروہ بن مسعود ثقفی' عامر بن شہر' معقل بن حیان' ثمامہ بن آثال حنیفہ

بن مسعودؓ احنفؓ ابوزید انصاریؓ عمرو بن مرہؓ عیاش بن ربیع مخزومیؓ واثلہ بن اسقعؓ عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ حاطب بن ابی بلتعہؓ سلیط بن عمرو بن عبد شمسؓ شجاع بن وہب اسدیؓ انہیں مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یمن یمامہ بحرین حجاز نجد غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران شام مصر حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت:

سیرۃ کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعت اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے سلسلہ بیان کے لئے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا آنحضرت ﷺ کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن:

قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے خود آنحضرت ﷺ اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا اس کی تبلیغ کے لئے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب اعمال اور سیرت سے بھی ممکن نہ تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا فرمایا۔

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ (فرقان)

تو اے پیغمبر منکروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور و شور سے جہاد کر۔

اس پیغام الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے۔ فرمایا:

﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾ (ق)

تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعے یاد دلا۔

قرآن رحمت عالم پیام عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے فرمایا

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ (فرقان۔۱)

برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ پر اس لئے اتاری تا کہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کر دے۔

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی

اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب:

عرب میں صرف تین قومیں تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین یہود

اور نصاریٰ، مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے' یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے تھے۔

اس بناء پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار مکہ کو پہلے دعوت توحید دی جاتی پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا' اور اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بناء پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے۔ تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے اس لئے ان میں بت پرستی کی مذمت' توحید کی ترغیب' عجائب قدرت کا بیان عذاب الٰہی سے تخویف اور معاندین قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن کا طرز خطاب بدل گیا چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ ان کی تحریفات اور ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتح مکہ کے بعد قبائل عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا اسی زمانہ میں سورہ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے' بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے وہ بھی ایرانی النسل تھے خالص عرب نہ تھے اس لئے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان کے ساتھ خطاب نہیں کیا ہے البتہ جابجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اور ان کے عقائد کی تردید اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کے لئے کیا چیز درکار تھی؟

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا' لیکن ابتداء میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا ان کے اوصاف پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل کا جویاں تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طائر قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا' چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام کو قبول کیا' وہ وہی تھے جو نیک طبع' ایماندار' راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف وخصائص سے واقف تھے' گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھے جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی وشمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن عمان' بحرین' یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن ومعاشرت' روایات اور رسم ورواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔ [1]

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں لیکن مسلمانوں کی کوئی تعداد

---

[1] مقدمہ کتاب الخراج ص ۱۹۲ (تاج علی شرح مسلم)

فتح مدینہ، یمن، عمان، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی، انصار مدینہ نے خود آ کر اسلام کو لبیک کہا۔ اطراف مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آ کر قریش کی تلوار کی آگ میں کود کر لا الہ الا اللہ پڑھا۔ یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لئے پیش کیا۔ اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف با سلام ہوا۔ ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا۔ وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا۔ ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زدوکوب کیا واپس آ کر آپ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر اہل عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے۔ (مسلم فضائل اہل عمان)

یمامہ کے رئیس ثمامہؓ قید ہو کر مدینہ آئے یہاں آزاد کر دیئے گئے مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا وہ ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے اور خونریزی کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافات بحرین میں تھا۔ اس قریہ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا۔[1] بارگاہ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل عرب پر پیش دستی کی چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔

اہل یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت ﷺ کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے بحری سفر تھا وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو باد مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا۔ جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرۃ تھا وہاں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہئے چنانچہ وہ لوگ یہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[2]

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے۔

﴿ الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ﴾

---

[1] بخاری باب الجمعۃ فی القری والمدن۔

[2] صحیح مسلم فضائل جعفر بن ابی طالب و اسماء بنت عمیس۔

وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ (التوبہ)

دیہاتی بدوی کفر و نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارے ہیں اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں۔ جو لوگ بدویت سے آ کر اسلام لاتے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام بیعت اعرابیہ تھا جو کم درجہ کی سمجھی جاتی تھی اسی بنا پر بدویت میں الگ تھلگ رہنا ہجرت کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔ [1]

اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع:

گزشتہ مباحث پر یک نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دینِ حق کو عرب میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو کیونکر کامیابی حاصل ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبولِ اسلام کے اسباب کی تحقیق کی جائے تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے

۱۔ اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا قرآن مجید جس موثر اور دل کو لبھا دینے والے طریقے سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع جن کا اوپر ذکر ہو چکا فنا ہو جاتے تھے۔ جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہر قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی تماشا آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا۔

﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (بقرہ)

تم خدا کا انکار کس طرح کر سکتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی پھر ایک دن تم کو مردہ کر دے گا پھر زندہ کرے گا اور پھر اسی کے پاس واپس کئے جاؤ گے۔

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ (بقرہ)

آسمان و زمین کی پیدائش میں، شب و روز کے اختلاف میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لئے سودمند چیزیں لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برسانے میں جس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں، دانشمندوں کے لئے بہت بڑی نشانیاں ہیں۔

﴿وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ﴾ (آل عمران)

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے برضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گزار ہے اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔

---

[1] صحیح مسلم باب [illegible]۔

﴿ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ (آل عمران)

آسمان وزمین کی خلقت اور شب وروز کے الٹ پھیر میں ان ارباب عقل کے لئے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔

﴿ هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَّجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ﴾ (یونس)

وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں کے لئے جاری ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعۃً) زور کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آ گئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ مخلص ہو کر خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔

﴿ وَمِنْ آيٰتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۔ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ ۔ وَمِنْ آيٰتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ ۔ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّلْعٰلِمِينَ ۔ وَمِنْ آيٰتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهِ ۔ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُونَ ﴾ (روم)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو اور تم دونوں میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی اس بات میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے اس بات میں جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

خدا یا ایک قوت اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے، لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے۔

﴿ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (ابراہیم)

کیا خدا میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾ (بقرہ)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اور اس نے تم کو زندگی دی اور پھر وہ تم کو موت دے گا پھر وہ تم کو زندہ کرے گا پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

عرب میں ملحد کم تھے، زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ

اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظام عالم ان ہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہ راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش غلہ کی پیداوار نباتات کی روئیدگی سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے اس لئے ان کو عبودیت کا جو کچھ تعلق تھا ان ہی معبودوں سے تھا وہ انہی کی عبادت کرتے تھے انہیں سے محبت رکھتے تھے انہیں پر نذر چڑھاتے تھے انہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے معرکوں میں انہیں کے نام کی جے پکارتے تھے اس بناء پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا' یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصل وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت موثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا ہے۔

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْۗءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَـفَاۗءَ الْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (نمل۔۶۳-۶۱)

کیا وہ جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا' اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں' اور اس کے لئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا' کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں' کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتے ہیں اور دکھ کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے' کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو' کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے' کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا ان سے برتر ہے۔ آیا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے' پھر اس کو لوٹاتا ہے' اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے۔ تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔

کفار اور مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ ﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴾ یعنی ہڈیاں گل سڑ چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا' قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا۔

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِيَ الْمَوْتٰى ﴾ (قیامہ)

کیا انسان پہلے منی نہیں تھا' پھر گوشت کا لوتھڑا بنا' پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے۔

غرض عقائد' عبادات' اخلاق' اعمال ہر چیز کو قرآن اس موثر اور دلنشین طریقے سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی

جبیر بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورۂ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے۔

﴿أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ، أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ ، أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ﴾ [طور ـ ۲ ـ ۳۵]

کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا خود خالق ہیں، کیا آسمان اور زمین کو انہیں لوگوں نے پیدا کیا بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں، کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں کیا یہی لوگ مدار کار ہیں۔

تو خود جبیرؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑ جائے گا۔[1]

طفیل بن عمرو الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے تو لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت ﷺ کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں لیکن جب اتفاق سے آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔[2]

ہجرت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے جواب ناکامی اور پتھر تھا تاہم خالد العدوانی نے جو طائف کے رہنے والے تھے آپ کو

﴿وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ﴾ (طارق)

قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارہ کی۔

پڑھتے سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی[3] اور آخر اسلام لائے۔

حضرت ابوبکرؓ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا، اس زمانہ میں حضرت موصوف نے ایک مسجد بنائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے لیکن نماز با آواز بلند پڑھتے تھے، آواز سن کر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتی تھیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچتا، چنانچہ اسی بناء پر کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو، اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوئی جاتی ہیں۔[4] انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی کی بنا پر لائے تھے جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلہ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔[5]

حبش میں جب آپ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے تحقیق حال کے لئے مکہ میں آئے اور

---

۱ صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ طور۔

۲ ان کے اسلام کا حال ابن قیم (زاد المعاد) نے بہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے۔

۳ مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۳۵۔

۴ بخاری شریف ذکر ہجرت۔

۵ مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۱۔

آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے آنحضرت ﷺ کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا انہوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔[1]

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی صدہا کافر مسلمان تھے۔[2]

ایک ضروری نکتہ:

عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے وہ صرف فصاحت و بلاغت کی بناء پر یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لئے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں ہے اس سے کہیں زیادہ معنی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجزہ ہوتا جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بناء پر اعجاز کا کام دیتا تھا دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے وہ خدا کی عظمت و جلالت، اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزا، بعث و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاق حسنہ کی تحسین ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دل میں گھر کرتے جاتے تھے ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لئے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ:

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام و اعتقادات باطلہ تھے جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی نے استیصال کر دیا عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعۃً فنا نہ ہو جاتے یہ ارباب اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بناء پر قبیلہ کا ایک معزز اور رئیس اپنے پورے قبیلے کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوت اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے انہوں نے بار بار

---

[1] ابن ہشام جلد اول صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ مصر ذکر ہجرت حبش۔

[2] صحیح ترمذی تفسیر سورۂ روم۔

دارالملک (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے ان میں سے کچھ فنا ہو گئے، کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی' اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی، اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی' اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان' ریاست و خود سری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے' غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلے کے رئیس باقی رہتے تھے صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا' اس لئے اگر کوئی خود غرضی کرنا بھی چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا۔ مولفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا۔

اب صرف معاش کی ضرورت سد راہ ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائع معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

۲۔ نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا' بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا' محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی' ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعی نبوت بظاہر جامہ بشریت میں تھے لیکن اپنی معنوی زندگی' اپنے معجزانہ اخلاق اور اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت اور اپنے روحانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا ۔ اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے صدق نبوت پر اسی مقدس و معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے۔

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (یونس)

اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے' کیا تم نہیں سمجھتے۔

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس سے ظہور نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا' بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں' نبوت محمدی کا معتقد اولین دنیا میں کون تھا' ام المومنین خدیجہؓ بنت خویلد' لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا؟ ۱۵ برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرۃ اوصاف و حالات کا تجربہ' وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں' "خدا کبھی آپ کو رسوا نہ کرے گا آپ رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہیں' ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہیں' محتاجوں کی خبر لیتے ہیں' مہمانوں کے ساتھ مدارات پیش آتے ہیں جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہیں۔"[1]

سن بچے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابوذر غفاریؓ نے انیس اپنے بھائی کو تحقیق حال کے لئے بھیجا انہوں نے واپس آ کر پیکر نبوت کا نقش ان الفاظ میں کھینچا' میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا

---

۱ صحیح بخاری باب الوحی۔

تکمیل دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ ۱

نبوت کے بعد قریش نے ذات نبوی کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا تاہم کوئی اخلاقی جرم بھی اس کے ساتھ منسوب نہ کر سکے اسلام کے سب سے اول اعلان دعوت کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو طلب کیا اور پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا تم مانو گے سب نے یک آواز کہا "ہاں تیری بات آج تک ہم نے کبھی جھوٹ نہ پائی" ۲ ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے ۶ھ میں ہرقل قیصر روم کے دربار میں کفار قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق شہادتیں پیش کر رہے تھے تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف نہ کہہ سکے انہوں نے شہادت دی کہ "محمد کبھی جھوٹ نہیں بولتے انہوں نے کبھی معاہدہ نہیں توڑا، شرک سے روکتے ہیں توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت، صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں" ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا یقین کیا۔ ۳

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محاسن اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، حسن معاملت، جود و سخا، عفو و درگذر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لئے عطا ہوا تھا قرآن مجید اسی نکتہ کو واضح کرتا ہے۔

﴿ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ (آل عمران۔ ۱۵۹)

اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے۔

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ تعصب و اوہام کو دم میں مٹا دیتی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں آپ نے دے دیں اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلہ میں آ کر اس نے کہا "لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد اس قدر دیتے ہیں کہ خود ان کو اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا" ۴

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے اس کو غنیمت سے بہت دیا، خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اس قدر دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے ۵ ہند خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی جنگ احد میں قوت بازوئے اسلام حضرت حمزہؓ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسی نے آپ کے دل کو چاک کیا تھا اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا لیکن اس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا اور اسی نے ان کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت

۱ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۳۹۸ قصہ اسلام ابی ذر۔
۲ صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت و صحیح مسلم کتاب الایمان باب فی قولہ تعالیٰ وانذر عشیرتک الاقربین۔
۳ صحیح بخاری باب الوحی۔
۴ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۹۱ باب ما سئل رسول اللہ ﷺ شیئا قط فقال لا و صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء۔
۵ صحیح مسلم باب مذکور۔

میں اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئی تب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی لیکن دربار رسالت میں پہنچ کر آپ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول پڑی یا رسول اللہ! سطح زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال ہے۔ [1]

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں" اس نے کہا کہ "میں تو لے ہی کے ٹلوں گا" آپ نے کہا "تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں" چنانچہ آپ ظہر سے لے کر عشاء کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضگی ظاہر کی اور خدمت اقدس میں عرض کی کہ "یا رسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے" آپ نے فرمایا "ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں" دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ "میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی صرف اس لئے کی کہ تورات میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں"۔ [2]

ثمامہ بن آثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا حسن اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا آنحضرت ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی آپ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے اس نے کہا کہ "اگر مجھے قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں گے تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا اگر مال کی خواہش ہے تو فرمایئے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا" یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس کے بند گرہ کھول دیئے اور رہا کر دیا۔ اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا اور غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو مخاطب ہوا "محمد! زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوش نما نظر آتا ہے"۔ [3]

ایک بار آپ کسی سفر میں تھے اور ساتھ میں مطلق پانی نہ تھا صحابہ نے پیاس کی شکایت کی آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھرے ہوئے لئے جا رہی تھی دونوں صاحب اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ آپ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیئے صحابہؓ نے باری باری سے پینا شروع کر دیا وہ کھڑی تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کے صلہ میں آنحضرت

---

۱ مسلم جلد ۲ صفحہ ۵۵ باب قضیۃ ہند۔

۲ مشکوٰۃ ص ۵۲۱ کتاب الحسن فی اخلاقہ ﷺ

۳ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۹۳ کتاب الجہاد والسیر۔

ﷺ نے کھجور آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں باندھ کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بددین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔ لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگان نبوت کے فیض اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا۔ [1]

نبوت کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اخلاق ہی کا اعجاز نہیں اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی معصوم شکل و صورت کی ایک ایک ادا اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے

روئے و آواز پیمبر معجزہ است (روی)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار اس کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا حضرت عبداللہ بن سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبر ان کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ فرما رہے تھے ﴿ افشوا السلام، واطعموا الطعام، وصلوا الارحام، وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام ﴾ [2] واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت ﷺ ابو ایوب انصاری کے مکان میں جونہی پہنچے حضرت عبداللہ بن سلام بھی آئے اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔ [3]

ضماد ایک شخص تھے جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہو گئے وہ آپ کے پاس گئے اور کہا "محمد! میں جنون کا علاج کرتا ہوں" اس کے جواب میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا۔

﴿ الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ ﴾

تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد چاہتا ہوں خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا، جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے آپ نے تین بار یہ کلمات اعادہ فرمائے تو انہوں نے کہا کہ میں نے کاہنوں جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے، لیکن آپ کے اس کلام کی طرح مؤثر کبھی نہیں سنا، وہ

---

1. بخاری جلد ا صفحہ ۵۰ کتاب التیمم۔
2. مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۵۱۔
3. بخاری جلد ا صفحہ ۵۵۵ باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ الی المدینہ۔

اسلام

یا

محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت ﷺ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس اہم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے تھے نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سنتے اور دیکھتے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے پیغام کی سچائی' وحی کی تاثیر' پیغمبر کی پُر اثر دعوت' اعجاز معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور موافق' مخالف' شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور دماغی تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں و تاباں ہوتا گیا یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت' ایک متحدہ سلطنت' ایک متحدہ اخلاقی نظام ایک کامل قانون اور ایک کامل شریعت' ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت خدا پرستی' اخلاص' ایثار' دین' تقویٰ' ایمانداری' اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا اور گویا یہی حقیقت تھی جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع میں (حجۃ الوداع) اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا۔

﴿الا ان الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق الله السموات والارض﴾ (بخاری)

(اب زمانہ گھوم کر اپنی اسی حالت پر آگیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ نے اپنی وفات سے کچھ دن پیشتر ایک نہایت پردرد الوداعی تقریر کے آخر میں یہ اعلان فرمایا۔[1]

﴿قد تركتكم على البيضاء ليلها كنهارها﴾

میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے

اور آخر حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ (مائدہ-۱)

آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے' لکھتے ہیں۔

"محمد کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا' آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی مرکز تھا وہ سلطنت مقرر کر گیا تھا بنیاد ڈال چکے تھے آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا' آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔[2]

---

[1] سنن ابن ماجہ باب اتباع سنۃ الخلفاء الراشدین و مستدرک حاکم کتاب العلم و مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۲۶۔

[2] انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ۸ صفحہ ۸۷۸۔

ایک دور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی نسبت جس کا علم عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق ہے بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داؤد مجاعص) نے لکھا۔

''دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس[1] کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب ایک نئے فلسفہ ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ امی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ سکتی ہیں حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تا کہ اقوام اسلامی میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں اپنی امت پر زکوۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بناء پر بزرگی حاصل ہے اس بناء پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا۔ یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کر دیا۔ نامسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے حکومت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے خاندانی ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کئے عورت کا مرتبہ بلند کیا نزاعات اور مقدمات کے فیصلہ کے قوانین بنائے، بیت المال کا انتظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا علم کی اشاعت اور تعلیم کی کوششوں کا بڑا حصہ دی اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔''

انگلستان کا مشہور انشاء پرداز کارلائل نے اپنے ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد عربی ﷺ ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار آپ ﷺ کی نسبت کہتا ہے

''قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا''۔[2]

---

[1] مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون قرآن ج ۱۵ ص ۸۹۸۔

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کئے اور اصلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو اور یہ اس لئے کہ تمام انبیاءؑ میں خاتم نبوت، مکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ﷺ ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی حالانکہ آپ نے فرمادیا کہ ”میرے بعد کوئی نبی نہیں میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔“ [1]

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب آتا تھا۔ بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیے حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے آپ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں اور اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت نہ کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو۔ [2] نبوت محمدی کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے، عرب کے بدوؤں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے آپ کی بعثت تھی، اس لئے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر ہدایات ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ سمجھا جاتا ہے اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لئے باہر سے کسی مذہب کی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات چھوڑ کر کہ جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آداب تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کا کاروبار، انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ، سب کا ماخذ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

آپ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے چار ابواب پر منقسم ہے اور انہیں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ نے بتایا کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ۔ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت، اس کو ایک نگاہ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسرا ان

---

1. صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبیین و جامع ترمذی کتاب الامثال۔
2. جامع ترمذی و سنن ابن ماجہ کتاب الطہارت۔

کے ساتھ ان کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے۔ خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قوتوں اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے، اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے۔ باہم انسانوں اور انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانونی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور اگر ان کی حیثیت قانونی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور ہدایات و آداب کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے اور انہیں دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے۔ عمل صالح کی تین قسمیں ہیں خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الٰہی کی پابندی اور ان کے ساتھ محبت و الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ، اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے، لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات اور دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے۔ الغرض محمد رسول اللہ ﷺ جو مکمل شریعت اور الٰہی ہدایت لے کر آئے وہ انہیں چاروں قانونوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق۔ انسانی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لئے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی ارکان ہیں۔

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت: انسان کے تمام افعال و اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات اور حقیقت اس کے چند بنیادی غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، انہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اسی کے اندر حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں انہیں چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا محور ہے، فرمایا:

﴿ الا و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا و هی القلب ﴾ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، خبردار کہ وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے ﴿قلب سلیم﴾ (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامتی کے راستے پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل ﴿قلب آثم﴾ (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے، اور تیسرا ﴿قلب منیب﴾ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا ہے اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب تبدیلیاں اسی ایک مضغہ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا محرک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس انجن کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿ انما الاعمال بالنیات ﴾ (صحیح بخاری آغاز کتاب)

تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ نے یوں ادا فرمایا

﴿ انما لامری ما نوی فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او الی امراة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه ﴾ (صحیح بخاری آغاز کتاب)

ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا۔

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہۃً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے، اب صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل

عقیدہ بن جائے اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت ہی ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم کو اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کرنے کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے مگر باایں ہمہ مشرک تھا اس کی نسبت آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ ﷺ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے ان کا ثواب اس کو ملے گا" فرمایا "نہیں اے عائشہؓ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بارالہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے"۔[1]

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ "اے محمد میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے" فرمایا "کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہو" اس نے جواب دیا "نہیں" فرمایا "واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں" دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ "کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان ہے" اس نے پھر نفی میں جواب دیا آنحضرت ﷺ نے پھر وہی فرمایا کہ میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نور اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔[2]

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کاروں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ (ابراہیم۔۱۸)

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ غزوات، شرح قمی دار المصنفین، مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ نمبر ۱۲۰ مصر۔

[2] صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم ص ۱۰۶ مصر۔

جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال اس راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں۔

﴿ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا ﴾ (نور۔۳۹)

جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی کی دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش و حواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے۔

﴿ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ۗ وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ ﴾ (نور)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج ہے اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو۔ اندھیرے میں ایک کے اوپر ایک کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لئے نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی اس لئے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی، وہ کام گو بظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے، اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے اسی بناء پر آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴾ (بقرہ۔۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور دکھ دے کر اس طرح نہ برباد کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنے مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو اور اس پر پانی برسا تو مٹی دھل گئی اور پتھر رہ گیا جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اگے گا نہیں۔ اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں

مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت نہ بنے تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں گے، وہ ہمارے دل کا نور نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دنی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

تورات میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے، مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے، انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر خدا کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لئے نہیں بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لئے اور خوارق عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لئے۔[1] اس کے برخلاف قدیم ایران کے بہت سے مجوسیوں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی، مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ عیسائیوں، زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی اتنی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے، جن سے انسانوں کے قوائے عمل مردہ ہو گئے اور ان کی تصوریت ان کی عملیت پر غالب آ گئی اور انسانوں کے قوائے عمل مردہ ہو گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے علم و عمل، تصور و فعل، حقیقت اور عملیت میں توازن ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا، اور عقائد کے اتنے ہی حصے کو یقین و اقرار ضروری قرار دیا، جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اور اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات اور نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا۔ آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول متعین کئے، اللہ پر ایمان لانا، اس کے فرشتوں پر ایمان، اللہ کے رسولوں پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا و سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے، ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے، اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تا کہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلۂ مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں، اور نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضا گناہوں سے پاک ہوں، ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغمبر کی سچائی پر اس دل سے یقین ہو کہ ہمارے جذبات ہمارے غلط استدلال ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم انہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے، اگر ان کی صداقت، سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی

[1] متی ۱۷: ۲۰۔

صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے پھر اچھے اور برے صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کیلئے نہیں ہوگی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں اور جو مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں اور مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ محفوظ کرتے جاتے ہیں تا کہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکل اور کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں یا الفاظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہو اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ جاہل و عالم بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جزا بدی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری کو محسوس کراتا ہے اس لئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے اور اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا' یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

﴿ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ...... وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ﴾ (بقرہ)
جو لوگ غیب (خدا) خدا کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر اے محمد اترا اور تم سے پہلے پیغمبروں پر اترا اس پر یقین رکھتے ہیں یعنی انبیاءؑ اور ان کی کتابوں پر۔

﴿ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ﴾ (بقرہ)
اور آخرت (روز جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا

﴿ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ﴾ (بقرہ۔ ۱۷۷)
لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر آخری دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔

سورہ کے آخر میں ہے۔

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ

وَرُسُلِهٖ ﴾ (بقرہ۔۳۵)

پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان لائے سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں انہیں عقائد کی تعلیم ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴾ (نساء۔۲۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری، اور جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

تم کو جو بھلائی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔

﴿ أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (آل عمران)

کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی تم ان کو پہنچا چکے ہو تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں نقص نہیں ہے ان میں اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لئے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں البتہ جو کوئی شریر ان دواؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے، حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہٖ نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لیے الگ اور بری چیزوں کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں۔

﴿ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (نحل۔ ۵۲،۵۱)

اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ، وہ ایک ہی خدا ہے تو مجھی سے ڈرو اور اسی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا:

(۴) شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص یا کسی شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا بزرگ پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں حضرت عیسیٰ، رام چندر، کرشن کو اسی غلو اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا اسی بناء پر قرآن مجید میں نہایت پرزور اور پررعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی۔

﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﴾ (نساء۔ ۱۷۱)

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھو اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔

﴿ لَّن يَسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ أَن يَكُونَ عَبْدًا لِّلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۚ وَمَن يَسْتَنكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ﴾ (نساء)

مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہے اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہو اور بڑائی کرے تو خدا سب کو اکٹھا اپنے حضور میں بلائے گا۔

﴿ لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَن يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (مائدہ)

وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہے کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح بن مریم کو اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک سکے خدا ہی کے لئے آسمان و زمین اور جو بیچ میں ہیں ان دونوں میں ہیں ان کی حکومت ہے اور خدا تمام چیزوں پر قادر ہے۔

﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ ۔ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِكَ ۔ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۔ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ ﴾ (مائدہ۔۱۱۶ ۔۱۱۷)

اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ ابن مریم تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ میری یہ مجال ہے کہ میں کوئی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے کہا ہوگا کہ تو جانتا ہوگا تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا تو بڑا غیب دان ہے میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت کرو جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔

آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ حاصل کون ومکاں تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید کی تھی۔

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ (کہف)

کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں مثلاً حضرت موسیٰ "کلیم اللہ تھے" حضرت ابراہیم" کا لقب خلیل اللہ تھا" حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے، لیکن آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ اشرف انبیاء تھے، آپ نے کیا لقب پسند کیا؟ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت!

﴿ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ﴾

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی۔ اس پر یہ آیت اتری۔ [1]

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَىْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۲۸)

تم کو کچھ اختیار نہیں ہے خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔

آنحضرت ﷺ بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام کے قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (قصص)

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ احد یہ حدیث صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔

تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے۔

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعائے مغفرت کی اس پر قرآن مجید میں آیا۔ [1]

﴿اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾ (توبہ)

تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا

آنحضرت ﷺ ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زائد از حد مدح نہ کریں جو بڑھ کر شرک تک پہنچ جائے۔ بار بار فرماتے تھے۔

﴿لا تطروني كما أطرت اليهود والنصارى﴾ [2]

میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ میں جا رہے تھے ایک شخص نے دفعۃً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ نے فرمایا ڈرو نہیں میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔ [3]

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں آپ نے فرمایا سید خدا ہے لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے بڑھ کر ہیں آپ نے فرمایا کہو لیکن دیکھو تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے [4] اصلی الفاظ یہ ہیں۔

﴿قولوا بقولكم ولا يستجرينكم الشيطان﴾

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپ نے فرمایا لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو شیطان تمہیں گمراہ نہ کر دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔ [5]

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد:

(۳) شرک کا یہ بھی مظہر ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز، جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی اتحاد رکھنا ہے، اس کا رخ دوسری طرف بدل جاتا ہے، ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اسی طرح جانتے ہیں کہ وہ

[1] بخاری کتاب التفسیر سورۂ توبہ۔

[2] بخاری جلد اول کتاب الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم۔

[3] شمائل ترمذی و مستدرک جلد ۳ ص ۴۸ علی شرط الشیخین واقرہ الذہبی۔

[4] ادب المفرد امام بخاری باب قول الرجل سیدی و ابو داؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح۔

[5] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۵۳۔

کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں انہی دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں انہی کو حاجت روا جانتے ہیں اٹھتے بیٹھتے انہی کا نام لیتے ہیں انہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے انہی معبودوں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیاء و صلحاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے اور صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔

﴿لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (ممتحنہ)

میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی درخواست کی تھی وہ نہیں قبول ہوئی البتہ یہ درخواست ضرور قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کر لوں۔[1]

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری کہ ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا "اے قریش! اے اولاد عبد المطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔"[2]

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جس کو حاجت روا سمجھتے ہو اور ان سے حاجتیں مانگتے ہو ان کو کائنات ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں۔

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا﴾ (بنی اسرائیل)

کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے جن کو تم پکارتے ہو ان میں جو خدا کے مقرب ترین ہیں وہ خود خدا کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں:

(۴) شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارق عادات کی نسبت غلط فہمی ہے جن اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ گو خدا نہیں ہیں لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے ہیں جو قدرت انسانی سے بالاتر ہیں یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتاؤں اور اوتار کا رنگ ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے حضرت عیسیٰؑ اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز۔

[2] یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خود نص نبوت بھی ہے تاہم یہ مسئلہ اسلام کے نزدیک مشتبہ اور مجمل رہا قرآن مجید میں خرق عادات کے متعلق حسب ذیل امور بیان کئے گئے۔

(۱) معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے۔

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (انعام)

اور کفار کہتے ہیں کہ اس (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا۔ کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲) باوجود اس کے کفار کو معجزہ نہیں دکھایا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں۔

﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (رعد)

اور کفار کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا، بے شک آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے راہ دکھانے والے ہیں۔

﴿وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا﴾ (بنی اسرائیل ۹۰ - ۹۳)

اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہریں جاری کر دو یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دو جیسا کہ تمہارا گمان تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ یا تمہارا گھر سونے کا بن جائے یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور جب تم اس پر چڑھ جاؤ گے تب بھی یقین نہ کریں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتار دو جس کو ہم خود پڑھیں، کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔

(۳) جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کئے وہ محض بے معنی تھے، اس لئے خدا نے آنحضرت ﷺ کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا۔

﴿وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (عنکبوت)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان پر خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے، کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان (کفار) کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر وہ کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اس میں رحمت ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے یاد دہانی کی چیز ہے۔

اسی لئے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت سے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے:

(۵) شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیاء یا پیشوایانِ مذہب کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کردیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں' قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری۔

﴿ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا ﴾ (توبہ-۴)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنا لیا ہے۔

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایانِ مذہب کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہتے حلال اور جس کو چاہتے حرام کردیتے" عرض کی کہ "ہاں" آپ نے فرمایا "یہی رب بنانا ہے"[1] عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے تھے لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے شریعت کی رو سے حلال و حرام کی تعیین جائز و ناجائز کی تفریق' امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں اسی بناء پر قرآن مجید میں ذات نبوی کی صفت رسالت کو بار بار کہا اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ﴾ (آل عمران)

محمد صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے اور رسول گزر چکے۔

﴿ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﴾ (نساء)

مریم کا بیٹا عیسیٰ اللہ کا صرف رسول تھا۔

اس حصر سے یہ مقصود تھا کہ نبی میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت و نبوت کے اوصاف ہیں۔

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم:

(۶) شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو افعال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ دوسروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات تھا لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے سجدہ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایانِ دین کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین و امراء کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روکا۔ بنی اسرائیل میں سجدہ تعظیمی یا سجدہ تحیت جائز تھا چنانچہ حضرت یوسفؑ کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچنا تھا سجدہ تعظیمی بھی منع کردیا گیا۔ ایک دفعہ ایک صحابی خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہل عجم کو دیکھا ہے وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں' آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا میری قبر پر گزرو

---

[1] جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور۔

گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟ عرض کی کہ نہیں۔ فرمایا تو اب بھی نہ کرو، اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔[1] اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ کو سجدہ کیا آپ نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرا بھی جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں فرمایا ایسا نہ کرو، اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔[2]

صفاتِ الٰہی کی توحید:

(۸) شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کئے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علم غیب ہے اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ نبیوں اور ولیوں کو علم غیب ہوتا ہے بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے عرب میں بھی کاہن یہی پیشہ کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئی کرتے تھے کبھی فال سے کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید و استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں خود قرآن میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں۔

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ (انعام)

اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

آنحضرت ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل یوں فرمائی اور فرمایا کہ مفاتح غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔[3]

۱۔ حمل میں لڑکا ہوگا یا لڑکی۔
۲۔ کل کیا ہوگا۔
۳۔ بارش کب ہوگی۔
۴۔ کس جگہ موت آئے گی۔
۵۔ قیامت کب آئے گی۔

اگرچہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر انہیں امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ تشریف

---

۱ ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ۔
۲ ابن ماجہ حق الزوج علی المرأۃ۔
۳ صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ انعام میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

فرماتے انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں گاتے گاتے انھوں نے یہ گانا شروع کیا۔

﴿ وفينا رسول يعلم ما في غد ﴾ [1]

اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا کہ یہ نہ گاؤ وہی گاؤ جو پہلے گا رہی تھیں [2] اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں۔

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ﴾ (انعام)

کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے۔

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (نمل)

کہہ دو اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں طرح طرح فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے ان کی سلطنت خاک میں مل گئی، بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی تباہ ہو گئے۔ صحابہ نے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ فرمایا اب نہ جایا کرو۔ عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے۔ فرمایا "یہ تمہارا وہم تھا، اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ رہا کرو"۔ بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں، انھوں نے کہا یا رسول اللہ ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں۔ فرمایا شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو جھوٹ ملا دیتا ہے یہ بھی فرمایا کہ "فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سیکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں"۔ جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا مال بتانے پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں عرب ان کو عراف کہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی عراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔ علم نجوم جس کے ذریعہ سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے تھے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ قرار دیا اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس کا انکار کرتا ہے۔ [3]

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی، فال، شگون، بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے مشرکانہ طریقے مٹ گئے، پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

---

1. صحیح بخاری کتاب [illegible]۔
2. صحیح بخاری کتاب النکاح۔
3. مشکوٰۃ باب الکہانہ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں، نجوم کی حرمت والی حدیث ابوداؤد، ابن ماجہ اور احمد سے لی ہے۔

مخفی قوتوں کا ابطال:

(۹) کائنات میں خدا کے سوا جن مخفی اسباب وعلل یعنی سحر وطلسم، جنات، شیاطین، ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی نسبت قدرت وتصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی، آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی و پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا اور وہ کلمات الٰہی کے سوا ہر نوع کے جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے، ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے بھی استمداد یا شرک کا شائبہ ہو کفر قرار پائے۔ اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لئے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (فاتحہ)

(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

سحر وطلسم وجادو اور ٹونکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (بقرہ)

یہ جادو اور ٹونکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے۔ اور یہ یہودی (جادو اور ٹونکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان دیتے ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو اس کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر وجادو کی حقیقت وہم وتخیل سے زیادہ نہیں فرمایا

﴿يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ﴾ (طٰہٰ)

مصری جادوگروں کے جادو سے اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا[1] تا کہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف وہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں بالکل بے بس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ "یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے اب آپ کیا فرماتے ہیں؟" ارشاد فرمایا "تم اپنے جھاڑ منتر ہمارے سامنے پیش کرو اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں" ایک اور صحابی نے ایک مجنون پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر چند روز پھونکا وہ اچھا ہو گیا اس نے ان کو انعام دیا۔ انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے واقعہ عرض کیا تو فرمایا "میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچی جھاڑ کی روزی کھائی" ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

﴿إن الرقى والتمائم والتولة شرك﴾ (ابوداؤد کتاب الطب)

۱۔ جامع ترمذی باب ما جاء فی حد الساحر و ابوداؤد باب اخذ الجزیۃ من المجوس۔

قرآن نے کہا:

﴿ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴾ (آل عمران)

اور اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹا عقیدہ گھڑ رکھے ہیں وہ ان کے مذہب میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی و ذاتی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا اسی لئے پوپوں کے سامنے اعتراف گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دینی حق ملا۔

پیغام محمدی نے ان کو مجرم قرار دیا اور کہا

﴿ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ﴾ (توبہ)

انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو خدا کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ

﴿ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ ﴾ (آل عمران)

خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے ہاتھ پر برابر بیٹھ کر خلق کا عدل و انصاف کرے گا قرآن پاک نے ایک بڑے موثر طرز میں اس کی تردید کی ہے قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا۔

﴿ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ ﴾ (مائدہ)

اے عیسیٰؑ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ

وہ کہیں گے بار الٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا جو تو نے کہا تھا میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو

﴿ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (مائدہ)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں حق رکھتے ہیں یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اور اسی عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے قرآن مجید نے کفار و غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقہ شفاعت کے اس عقیدہ باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں سب اسی کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

﴿ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ (زخرف)
یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔

﴿ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴾ (مریم)
یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔

﴿ أَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ آلِهَةً إِنْ يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنْقِذُونِ ﴾ (یٰسین)
کیا خدائے برحق کو چھوڑ کر میں نے معبودوں کو خدا بناؤں اگر رحمن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے حکم ہوا۔

﴿ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ﴾ (نجم)
اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ کام نہیں پہنچا سکتی لیکن اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔

﴿ أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ﴾ (زمر۔۵)
کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کسی کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ اگرچہ یہ کچھ اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ سمجھتے ہوں تو بھی شفیع بنانے کے قابل ہیں۔

خدا قیامت میں ان سے کہے گا۔

﴿ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ﴾ (انعام)
اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان شفیعوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری حیثیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں

﴿ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ ﴾ (روم۔۲)
اور جب قیامت کھڑی ہوگی تو مشرکین ناامید ہوں گے جن کو وہ خدا کا شریک قرار دیتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوں۔

قوم یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا۔

﴿ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ .... وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴾ (بقرہ)
اے فرزندان اسرائیل! .... اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی ایک دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے۔

﴿ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ .... وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾ (بقرہ)

اے فرزندان اسرائیل! .... اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرہ بھی کام نہ آسکے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں شفاعت کے بھروسے میں نہ رہیں۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ﴾ (بقرہ۔ ۳۴)

اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دی ہے اس میں سے کچھ خرچ کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ تجارت ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے۔

غرض آپ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

﴿ أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ۔ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾ (زمر)

کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کیا گو ان کو کسی چیز کا اختیار نہیں اور نہ ان کو سمجھ ہے تو بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدہ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدہ شفاعت کا اتنا حصہ صرف تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے

﴿ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ (زخرف)

اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے۔

﴿ لَّا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴾ (مریم)

یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعے سے) اقرار لے چکا ہے۔

لیکن اس شہادت حق اور عہد الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے۔

﴿ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ﴾ (یونس)

(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ﴾ (بقرہ)

کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اس کی اجازت سے۔

﴿ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ﴾ (نجم)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آ سکتی البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔

﴿ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ (نبا)

یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو شفاعت کی اجازت دے گا، فرمایا۔

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ ﴾ (سبا-۳)

اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی لیکن اس کے لئے جس کے لیے وہ شفاعت کی اجازت دے۔

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش انہیں کی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا، فرمایا

﴿ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴾ (انبیاء)

اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے۔

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لئے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم رہ گئے۔

﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴾ (مدثر)

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔

﴿ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ﴾ (مومن)

اور ظالموں اور مشرکوں کا[1] نہ کوئی دوست اس دن ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

اور وہ بد نصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند ہے وہ مشرکین ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ﴾ (نساء)

اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔

لیکن ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی انہی کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا

---

۱ (ان الشرک لظلم عظیم (لقمان-۲) "بے شک شرک بڑا ظلم ہے" صحیح بخاری کتاب الایمان جلد نمبر ا صفحہ ۲۸)

صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلال الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفت کریمی و رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی اسی لئے ارشاد ہوا۔

﴿وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾ (انعام)

اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر) ان لوگوں کو ہشیار کر دے کہ اس سے ڈرتے رہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے کہ ان کے لئے اس کے سوا کوئی حامی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں۔

﴿مَا لَكُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ﴾ (سجدہ)

خدا کے سوا تمہارا کوئی حامی اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں۔

خدا کی اس صفت کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوسکتے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو ان کو اس دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ ہے ان کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضل عمیم کے مظہر قرار پائیں گے نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمت الٰہی نے چنا ہو اس منصب پر ممتاز ہوسکیں گے خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو دنیا میں رحمۃ للعالمین کا مظہر بن کر آیا۔

اجرام سماوی کی قدرت کا انکار:

۱۷۔ بظاہر اس دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہوگیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

﴿لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ﴾ (فصلت)

سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی موثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

﴿وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ (جاثیہ)

ہم کو زمانہ مارتا ہے۔

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں "فلک کج رفتار" اور "دہر ناہنجار" کی شکایت اب تک بھی آتی ہے عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے ان کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے[1] آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ "زمانہ کو گالی نہ دو کیونکہ زمانہ خود خدا ہے"[2]

1۔ فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ صفحہ ۴۴۴ کتاب الادب والصفات کی صفحہ ۴۶۵ جلد ۱۰۔

2۔ صحیح مسلم الفاظ الادب۔

کہتے ہیں کہ حضور کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے قصداً اپنی جانب سے یا کسی اور کی بات دہرانے میں بھی باپ کی قسم کھائی۔[1] ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے، اس پر ایک یہودی نے آ کر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو، آپ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ کعبہ کی نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو۔[2] ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول خدا ﷺ سے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا۔[3] دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔[4]

خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں:

(۱۴) اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہے، اس لیے جو صرف یہ عقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس وہمی غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتا دیا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے، تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں، خدا کے ساتھ اور کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں، لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا، توحید کامل کے معلم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الٰہی کے علاوہ کوئی اور مستقل مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اسی کی تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی صاحبان نظام اور بزرگوں کے ساتھ تکلم میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں، آنحضرت ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا۔ اس قسم کا طرز کلام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا تھا اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمت نبوی میں آ کر مسلمانوں سے کہا کہ "تم لوگ شرک کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہیں" آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یوں کہو کہ "وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپ چاہیں"[5] ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے، تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمد چاہیں، ان صحابی نے خدمت اقدس میں آ کر اپنا یہ خواب بیان کیا، آپ نے فرمایا میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا یوں کہو کہ "جو خدا چاہے پھر جو محمد

---

۱ یہ تمام روایات بخاری و مسلم و نسائی کتاب الایمان میں مذکور ہیں۔

۲ نسائی کتاب الایمان، الحلف بالکعبہ۔

۳ جامع ترمذی ابواب النذور والایمان، مستدرک حاکم جزء اول کتاب الایمان۔

۴ مستدرک حاکم بحوالہ مذکور۔

۵ نسائی کتاب الایمان والنذور۔ ۶ ابن ماجہ کتاب الکفارات۔

نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپ نے فرمایا تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں؟ بولے شریح، مسلم، عبداللہ۔ آپ نے پوچھا سب میں بڑا کون ہے؟ عرض کی شریح، فرمایا تو تمہاری کنیت ابو شریح ہے۔[1]

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی انہوں نے کہا شیطان کا برا ہو آپ نے فرمایا یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا میری قوت سے یہ ہوا تھا اللہ کا نام لو تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا۔[2]

تصویر بنانے سے سخت منع کیا اس کی وجہ تھی کہ اول اول لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہی تصویروں کی پرستش ہونے لگی تھی چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھولک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا:

(۱۶) شرک کا ایک ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں سالانہ جمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے ان تمام افعال سے منع کیا۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا۔[3] عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنایا۔

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے:

(۱۷) یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا، لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے وہ قلب و روح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسانی محرک ہوتا ہے کوئی حب شہرت کے لیے کام کرتا ہے کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیے کرتا ہے کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیے کرتا ہے کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے اسی کو قرآن مجید نے کہا۔

﴿ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ (فرقان)

۱ ابوداؤد کتاب الادب باب تغییر الاسماء۔

۲ ابوداؤد کتاب الادب باب لا یقول خبثت نفسی۔

۳ صحیح مسلم کتاب المساجد۔

یا شرک اصغر کیا ہے؟" فرمایا "ریا، قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا خدا ریاکاروں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے ہاں کچھ نہیں تم انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے ۔[1] حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ "ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا کہ دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں؟ ہم سب نے عرض کی "ہاں یا رسول اللہ ﷺ" فرمایا "وہ شرک خفی ہے" یعنی یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے ۔[2] ابوسعید بن ابی فضالہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی آ کر پکارے گا کہ جس کسی نے اپنے عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اس غیر سے مانگے کہ خدا ساجھے سے بے نیاز ہے"[3] ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا ۔[4]

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے۔ شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات میں ریا کو شرک اصغر کہا کرتے تھے ۔[5] ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ جا رہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ صحابی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ "ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے" ۔[6] اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شداد بن اوسؓ صحابی اپنی جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں اور رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے عرض کی میرے ماں باپ حضور پر فدا ہوں اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے ارشاد ہوا کہ میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں "عرض کیا یا رسول اللہ وہ کیا ہے؟" فرمایا شرک اور چھپی نفسانی خواہش۔ میں نے دوبارہ گذارش کی یا رسول اللہ ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا اے شداد ! میری امت چاند سورج یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی عرض کیا "یا رسول اللہ کیا ریا

---

۱ ابن حنبل، مسند محمود بن لبید انصاریؓ صفحہ ۴۲۸ جلد ۵ اور ابوداؤد و مسند ابن حنبل۔

۲ سنن ابن ماجہ باب الریا والسمعہ ۔

۳ سنن ابن ماجہ باب الریا والسمعہ و مسند ابن حنبل۔

۴ ابن ماجہ باب الریاء۔

۵ مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد ۴ صفحہ ۳۲۹ (صحیح)۔

۶ مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد ۴ صفحہ ۳۳۰ (صحیح)۔

قریب ہے؟ فرمایا "ہاں"۔

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے انہوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کرلی۔

ل [illegible]

توحید

اور

اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے یعنی توحید کے مخالف عقائد اور خیالات کی نفی اور تردید لیکن نبوت محمدی کا کارنامہ اس سے بالاتر ہے اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، اصول ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں دوسرے مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہو سکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے دنیا کے تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دیا گیا تھا یک قلم محو کر دیا۔ بت پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتب، متعین، صحیح عقائد اور سچے یقینوں سے معمور چند حقائق کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کے لیے بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل:

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے۔ دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے بیچ ان کی بعثت ہوئی ان کے لیے دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ان کے زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا الحاد کا وجود نہ تھا لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کے لئے تھی اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی کے بعد جب انسان تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرتا جائے گا اور قدرت کے سربستہ خزانے وقف عام ہوتے جائیں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل و براہین ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے جن میں مشرکین کا وجود تھا ملحدین کا نہ تھا لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں کے لیے ہوئی اس لیے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں اس لیے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، مشککوں، دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صانع کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ

مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے، پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اول تو خود انسان کی پیدائش، پھر ان میں عورت مرد کا جوڑا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر، پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کیسے کیسے ہیں، پھر خود انسانوں کے اندر کے اعمال، دیکھو ایک ایک عمل کی حقیقت پر غور کرو یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

﴿ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّہَارِ وَابْتِغَآؤُکُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ ﴾ (روم۔۲۰-۲۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر تم آدمی بن کر پھیلتے پھرتے ہو اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا، اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے، اس میں جاننے والوں کے لئے یقیناً نشانیاں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا ہے اور تمہارا اس کی مہربانی کو تلاش کرنا ہے، اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں نشانیاں ہیں اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم ڈرتے ہو اور بجلی (رحمت کی بارش کی) امید رکھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کے مرے پیچھے زندہ کرتا ہے، اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں نشانیاں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

اس اخیر آیت میں آسمان و زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے۔ تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ غور و عبرت انگیز ہے۔ سورۂ لقمان میں آسمانوں کے کسی نظر آنے والے سہارے کے بغیر کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر تھمے رہنے کا ذکر ہے۔ یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوت کشش ثقل ہی کیوں نہ ہو وہ بھی تو اسی کے کارساز ہاتھ سے ہے۔ اس کے بعد ایک جان دار اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھرنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے۔

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَہَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَبَثَّ فِیْہَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْہَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ ﴾ (لقمان۔۱۰)

اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان

قدرت کی نقاشی عجیب ہے۔ پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برجوں کو طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

﴿ تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا ﴾ (فرقان)

بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکنے والا چاند رکھا۔

انہیں چند چیزوں میں اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی نظم و ترتیب اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے۔

﴿ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (نمل)

اس ہستی کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط و مستحکم بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں نظم و ترتیب کی بندش نظر آتی ہے۔

﴿ مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ ۖ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ﴾ (ملک)

تجھے مہربان خدا کی بناوٹ میں کوئی بے ربطی نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا کوئی خلل دکھائی دیتا ہے، پھر بار بار دوبارہ نظر اٹھا، تیری نگاہ درماندہ ہو کر تھک کر تیری طرف پلٹ آئے گی۔ (مگر کوئی نقص نہ پائے گی)

اس قسم کی اور بیسیوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے۔ ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں۔

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب ہونا۔

۳۔ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی کا ایک دوسرے سے باہم مربوط و متعلق ہونا اور ایک کا دوسرے کا محتاج ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے ہیں بلکہ کسی علیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت و ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

اہل فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہۃً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے علل و اسباب ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہوگا یا یونہی مسلسل چلا جائے گا، اگر یونہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گذر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہوسکتا اور نہ کہیں اس کا آغاز ہوسکتا ہے اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہوسکتی۔ تسلسل عقلاً محال ہے، بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر اس سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس مقام پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خالق و پیدا کنندہ اور وجود کون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت پیچیدہ اور اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے۔ قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے۔ سورۂ نجم کی آیت میں ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (ہود)

اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات، اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اسی کو پوجو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔

﴿وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ (نجم)

اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا

آنحضرت ﷺ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چند صحابیوں نے آ کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے۔ فرمایا کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہو گئی؟ گزارش کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا یہ تو خالص ایمان ہے، مقصود یہ ہے کہ دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو انتہا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ چیز اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے ﴿اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ﴾ میں اللہ پر ایمان لایا۔[۱]

یہ تعلیم درحقیقت اس مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے وہ اس کے بعد کوئی علت نہیں اس لئے یہ وسوسہ قابل جواب نہیں یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں

اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے مذہب بھی ہیں جو دو یا تین اور متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک سلطنت کو ٹکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی عملداری قرار دیتے ہیں وحی محمدی نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور تعلق ہے۔ دنیا میں ایک دانہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے سے موافق و متناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل پیدا نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے، پھر اس کے روکنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ (انبیاء)

اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدا کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

---

۱ یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں۔

سے اس دنیا کے عالم کو فرمانروائے مطلق کی وحدت کا ثبوت ہے۔

توحید کی تکمیل:

توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب اور ادیان کی مشترک اور بنیادی تعلیم ہے۔ لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس عمارت کو چند بنیادی اصول کے پتھروں پر تعمیر کیا، یہ پتھر کیا ہیں؟ یہ پتھر خدا کی حقیقی عظمت کی معرفت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین ہیں۔

خدا کی حقیقی عظمت:

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے مگر اس کو قدرت کے کارخانہ کا تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لئے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا، وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولاد بیٹیاں تھیں۔ عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح ابن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو سلطنتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما، گنیش اور بشن تین نے مل کر خدائی کے کاروبار کی باہم تقسیم کر لی تھی۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے، اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کو حصہ نہیں، اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ شجر و حجر، جنگل، دریا، پہاڑ، صحرا، سورج، چاند، زمین و آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے، فرش سے عرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے، وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے، وہ ہر قسم کے صفات عالیہ، اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے، اس کے مانند کوئی نہیں، کوئی اس کی شبیہ و مثال نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتہ ناطے سے پاک ہے۔

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (زمر)

وہ ہے اللہ تمہارا رب، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔

﴿لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (زمر)

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔

﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (انعام)

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ (انعام)

چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ ﴾ (قصص)

اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (شوریٰ)

اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

﴿ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ﴾ (مومن)

وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

﴿ وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ ﴾ (انعام)

غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔

﴿ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (آل عمران)

اے خدا اے بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت نصیب کرے تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے بیشک تو ہر بات پر قادر ہے۔

﴿ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴾ (یونس)

اگر خدا تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

﴿ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴾ (بقرہ۔۳۴)

خدا اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں اس کو نہ اونگھ ہے نہ نیند آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو خلق کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے اور وہ اس کے علم کے کسی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے اس

کا قبضہ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہے، آسمانوں کی اور زمین کی ہر شئے اس کی تقدیس میں مصروف اور سرگرم ہے۔

﴿ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۔ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ (حدید۔۱)

جو کچھ زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے وہ سب جانتا ہے اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے، اور تم جو کچھ کرتے ہو خدا اس کو دیکھتا ہے، آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (فاتحہ)

سب تعریف اس کے لئے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔

﴿ وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (آل عمران۔۹)

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔

﴿ وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۔ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴾ (بروج)

وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے۔

﴿ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ﴾ (جمعہ۔۱)

آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ ﴾ (اسراء)

اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودان باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی خدائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج چاند تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ جن و انس، شجر و حجر، بحر و بر سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سرنگوں نظر آنے لگے، بجز اس کے سوا کون تھا جو بہ تحدی اس کے ساتھ یہ ﴿ اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا ﴾ [میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں] کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ

توحید محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالم خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے۔ جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو پوجا کرتے ہیں، جنات اور ارواح خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں، انسانی صورتوں کو رب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت انسان کے مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں۔ انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی

زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔ قرآن کی ابتدائی سورۃ میں آدمؑ کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے۔ اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا۔ اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا۔ وہ ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے۔ کروڑوں مخلوقات الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا۔ یہ منصب الٰہی نہ فرشتوں کو ملا نہ آسمان کو نہ زمین کو نہ پہاڑ کو۔ صرف انسان ہی کا سینہ اس امانت کا خزانہ قرار پایا اور اسی کی گردن اس بوجھ کے تحمل کے قابل نظر آئی فرمایا:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ (احزاب)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی۔ سب نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

وحی محمدی نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو بزرگی سے سرفراز فرمایا عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے۔

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل)

ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی

انسان ہی وہ ہستی ہے جو سب سے معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں مخلوق ہوئی۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ (التین)

البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔

یہاں تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا۔ متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔[1] اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو مارو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورت الٰہی کا عکس ہے۔ حتیٰ کہ میدان جنگ میں اگر کوئی کسی سے لڑ رہا ہو تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہئے۔[2] کیونکہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ غصہ میں بھی کسی کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑے کیونکہ خدا نے آدم

---

1. صحیح بخاری کتاب الاستیذان، ابن ابی عاصم فی السنۃ، طبرانی کی حدیث ابن عمر میں ہے، متعدد ثقات والے باب الغضب، فی الباری ابی ہریرہ، صحیح مسلم کتاب البر میں بھی یہ ٹکڑا ان الفاظ میں ہے "جس کو تم مارو تو چہرہ بچاؤ کہ وہ خدا کی صورت پر پیدا ہوا ہے" (فتح الباری ج ۵-۲)۔
2. صحیح بخاری کتاب العتق، صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ۔
3. صحیح مسلم ... یہ ٹکڑا ... حدیث ... ہے۔

اس بے ذرہ بندگی کیا حقیقت ہے؟ اور اس سے محبت بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں اور اگر کی جا سکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ کیا اس کے احکام واجب الاطاعت بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کن سے ناخوش؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کرسکتا ہے؟ اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے؟ کیا ہم اس کے نزدیک اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا جاہلیت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ وہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت، ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے اور اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ پر نافذ، اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض، اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے منزہ و پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی روشنی، بھٹکوں کی رہبری، ناامیدوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کا قرار اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کردے اور جب چاہے ان کو پھر پیدا کردے، اس کی محبت دین کا حاصل ہے، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود، اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ (رعد)

ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان کی دولت ملتی ہے۔

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا وہ اس کے سوا سب کچھ بھول

گئے، وہ اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر حال میں اسی کی یاد میں سرمست و سرشار ہو گئے۔

﴿يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران)

وہ خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں رہبانہ زندگی بسر کی، نہ دولتمندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکشوں سے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا، اور خدا کا حکم جان کر اسکو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے، دوران تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (نور)

وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبت الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا، خدا نے انکی توصیف کی کہ

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (بقرہ)

ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی، ان کی صداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبہ ایمانی کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ (طلاق)

جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ (زمر)

کیا خدا اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں

﴿وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ﴾ (احزاب)

اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہئے۔

ان میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء و صفات:

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے ہیں، ہماری حقیقت رسی سمجھا دیکھا ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مقررہ اصول منطق کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک بھی مثال پیش نہ کر سکے، جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات، عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی خطانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں جب مادیت کا یہ حکم ہے تو

دراصل وہ اس حق میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی کا طور اسی مرکزی تخیل کی تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی۔ عرب کا جاہل اللہ نام ایک الٰہ حق سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی وہ غافل ہی تھا۔ دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا۔ قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی آگاہ تھے بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ "رحمان" کا لفظ بھی مستعمل ہوتا تھا جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں اصحاب الفیل کے رئیس عیسائی ابرہہ کے نام سے موسوم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن نے نقل کرا کر شائع کیا ہے اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے۔ عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑ ہو گئی تھی اسی لئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم تحریر کرائی تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ قسم ہے خدا کی مجھے نہیں معلوم [1] کہ رحمان کیا ہے؟

محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لیے رحمان کے لفظ کے استعمال سے مشرکوں کو بڑی ہول تھی اور کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ﴾ (فرقان)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہے؟ کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں؟ رحمان کا نام ان کی نفرت اور بڑھا دیتا ہے۔

مشرکین کو یہ بات کھلتی تھی کہ محمد ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح و ستائش کرتے ہیں

﴿ أَهَٰذَا الَّذِي يَذْكُرُ آلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ هُمْ كَافِرُونَ ﴾ (انبیاء)

(مشرک آپ کو دیکھتے ہیں تو مذاق سے کہتے ہیں کہ) کیا یہ وہی ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور یہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی نے عرب کے ناآشنایان حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء و صفات کی کوئی حد نہیں اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔

﴿ قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ﴾ (اسراء)

---

1 صحیح بخاری جلد ۱ کتاب الشروط ص ۳۸۰۔

کہہ دو (اے پیغمبر) کہ خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا مسئلہ اسلام کی ان اہم مذہبی اصطلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام "یہوا" تھا مگر کسی عام یہودی کو اس مقدس نام کو زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی دوسرا عام نام "الوہیم" ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے ان کے علاوہ اس کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور افعال ربانی کے ترجمان ہیں تورات کا دفتر ان سے خالی ہے۔ صفات الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والا خداوند یعنی "رب الافواج" کا لفظ ہے جو اس کی صفات جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں باپ کا لفظ خدا کے لئے استعمال ہوا ہے اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس لفظ کے اطلاق سے مقصود کیا ہے اور گوشت پوست اور مادیت سے مبرا ہونے کے لفظ کا خدا پر مجازی استعمال بھی کہاں تک جائز ہے؟ اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کی صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس، حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت تھیں۔ باپ حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور یہ تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں اس تشریح سے صفات الٰہی کے تجسیم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کی جگہ تین خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نیرنگی نظر آتی ہے لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد ہو گیا ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب انہی مجسم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں یعنی برہما، بشن اور شو تین صفات خالق، مبقی، ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی۔ شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے حیات، علم اور سرور یا آنند۔ جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی۔ عام ہندوؤں میں تین سو تینتیس کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات و اسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کیا اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں۔ مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دو صفتوں ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے۔ اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح اس حقیقت کو روشن کیا وہ نبوت محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے۔

آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا شمار گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ اور رب کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں۔

آپ نے یہ دعا سکھائی "اے خداوندا! تیرے ہر اس نام کے وسیلے سے جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لئے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں"۔ حضرت عائشہ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی۔

خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے بعض کو ہم نے جانا اور بعض کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں[1]۔ قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا۔

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکہف)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی گرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر بھی کیوں نہ لے آئیں۔

دوسری جگہ کہا گیا

﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ (لقمان)

اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لئے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں۔

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى﴾ (طٰہٰ)

نہیں ہے کوئی معبود لیکن وہی اللہ اسی کے لیے ہیں سب اچھے نام۔

بھلائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لیے ہے خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں۔

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى﴾ (اسرائیل)

کہہ دے (اے پیغمبر) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جو چاہے کہہ کر پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بھلائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو۔

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَاۗىِٕهٖ﴾ (اعراف)

اور اللہ ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی کا صحیفہ دین اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا ہر صفحہ اس کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے قرآن پاک کا کم کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی کسی وصف اور نام پر نہ ہو اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور معبود عالم کے ساتھ قرآن کے پیروؤں کے دل میں ہونا چاہئے۔

۱؎ یہ پوری دعا بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں روایت کی ہے اور یہی کلمات مسند ابن حنبل میں بھی (بسند عبداللہ بن مسعود) ہے۔

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ (نور)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو نہ وہ پورب ہے نہ پچھم ہے اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو روشنی پر روشنی خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے اور خدا لوگوں کے سمجھانے کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِيْمُ ﴾ (بقرہ)

اللہ نہیں ہے اس کے سوا کوئی اور معبود وہ ہمیشہ زندہ، تمام دنیا کو سنبھالے ہے اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ہے جو اسکی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور وہ اسکے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن جتنے کا وہ چاہے اسکا تخت آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے اس آسمان اور زمین کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۞ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۞ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (حشر۔۲۲۔۲۴)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں سب کا بادشاہ، پاک، پوری سلامتی، امن والا ہر شے پر نگراں غالب سب پر دباؤ والا بڑائی والا ہر چیز اس سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بتاتے ہیں وہی اللہ پیدا کرنے والا بنانے والا ہر چیز کی صورت کھینچنے والا اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْیٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۞ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ۞ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ يَعْلَمُ

مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (حدید-۱)

آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں وہی غالب اور دانا ہے آسمانوں اور زمینوں کی حکومت اسی کی ہے وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے وہی کھلا ہے اور چھپا ہے اور ہر بات کو جانتا ہے وہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر تخت پر برابر ہوا وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے اور جو زمین میں سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو آسمان میں چڑھتا ہے اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے وہ سینوں کے سب بھید سے واقف ہے۔

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اسکو ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کے آباء و اولاد اور بیویوں اور کنیزوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو یعنی گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا اس کے جواب میں وحی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی۔[1]

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ، اللَّهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ (اخلاص)

کہدے (اے پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جائے پناہ ہے نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے (جس نے اس کو جنا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے (جو اس کی بیوی ہو)

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے۔ حضرت ابیؓ صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے وہ اس کے بعد اس سورۃ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "صمد" وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اسکو جنا ہو کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنے وارث و جانشین بھی ضرور چھوڑتا ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کا مثل ہے" غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک اعلیٰ اور بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب کے اور قبیلے کے ایک فرد ہیں لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض سے منور ہو چکا تھا حضرت ابو ہریرہؓ آپ سے نقل کرتے ہیں کہ "خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھ کو جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی۔ اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ اخلاص میں یہ آیا ہے (جامع ترمذی تفسیر سورۂ اخلاص و مسند ابن حنبل صفحہ ۱۳۳ ج ۵)۔

کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ وہ ایک اور صمد ہوں جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے [1] یہ حضرت ابو ہریرہؓ کی عرب ہیں، یعنی اہل عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیم محمدی سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ اس تنزیہ و تقدیس کے موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ "صمد" کا ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے صمد کے معنی لغت میں اونچی چٹان کے ہیں جو کسی ایسی وادی میں ہو جہاں سیلاب آتا ہو تو اس پر چڑھ جاتا نہ ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنے کو بچاتے ہیں پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا ہے جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو اسی لئے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھانا نہ کھاتا ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو ﴿صمدۃ﴾ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صمد وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں کمال درجہ پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پرواہ بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجہ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی ہر طرح کامل ہو، یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو [2]

ان معنوں کے علاوہ صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں۔

ابن عباسؓ: وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصری: وہ حی و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انس: جس کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعودؓ: جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضاء نہ ہوں۔

بریدہؓ: جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمہ و شعبی: جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہ: جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہ: باقی غیر فانی۔

---

۱ صحیح بخاری سورۂ اخلاص۔

۲ کتاب الاسماء والصفات للبیہقی صفحہ ۴۴۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی[1] اسی ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں تاہم اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے اصلی معنی چٹان کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے۔ اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لیے چٹان کا لفظ آیا ہے استثناء (۳۲-۳۲) میں ہے۔

"اگر ان کی چٹان انہیں بیچ نہ ڈالتی اور خداوند ان کو اسیر نہ کرواتا کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان"۔

یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے سموئیل کے پہلے صحیفہ میں یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے

"خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں، تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں" (۲-۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں احد (ایک) اور صمد (جائے پناہ) یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں۔ اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں نہ اس کو کسی کی حاجت نہ اس کو کسی سے غرض۔ وہ یکتا، تنہا، اکیلا، بے جفت، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا، سب کی چٹان، مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔

﴿ففروا الی اللہ﴾

ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے پاس پناہ لو

یہ سورہ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا ہے۔ ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی انہوں نے کہا "اس میں میرے رب کی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں" آپ نے فرمایا "بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے"۔[2] ایک اور انصاری تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد اس سورۃ کو پڑھ لیتے تھے تب کوئی دوسری سورۃ پڑھتے تھے ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر یہ روش چھوڑنی منظور نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گزارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے یہ سورۃ بہت محبوب ہے۔ ارشاد ہوا "یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی"۔[3] قتادہ بن نعمانؓ صحابی تھے جو رات رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کا

---

[1] ان معانی کے لیے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی صفحہ ۳۴، مفردات القرآن راغب اصفہانی، ابن جریر طبری، ابن کثیر اور تفسیر سورۃ الاخلاص ابن تیمیہ۔

[2] صحیح بخاری کتاب التوحید۔

[3] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ۔

تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔[1]

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو محفوظ رکھے یا گنے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ خدا طاق ہے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے"۔[2] آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ٩٩ نام کیوں رکھے گئے پورے سو کیوں نہ مقرر کئے۔ یہ اس لئے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا رمز آشکارا نہ ہوتا۔ صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ٩٩ ناموں کی تصریح نہیں ہے۔ مگر ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے۔ لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ "یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں"۔ پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا اول بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں، اسی لئے علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ان ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے اس لئے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محدود ہیں بلکہ بڑے بڑے آئمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر بن عربی، امام نوویؒ، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہؒ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفات الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے[3] اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغاز مضمون میں اوپر گذر چکی ہیں استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علماء نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت کے قرآن پاک میں آئے ہیں یا وہ افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں یا آنحضرت ﷺ نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا، وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے۔ علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں۔ ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگذر یعنی صفات جمالی ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے ہم ان کو صفات جلالی کہتے ہیں۔ تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہ، بلندی کمالات کی جامعیت اور ہر قسم

---

1. مسند احمد مسند ابی سعید خدریؓ۔
2. صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم۔ کتاب الذکر و مسند احمد مسند ابی ہریرہؓ و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابو عوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ۔
3. تحریر ابو منصور رسالہ المقول الثالث فی عدد الاسماء ماثورہ جو ایک مشہور مستند کتاب ہے۔

نے ان اوصاف حسنہ اور مکارم عالیہ کا ثبوت ہوتا ہے جن کو ہم صفات کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

الغرض خدا کے تمام اسماء وصفات انہیں تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا ان سے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے یا ان کی تنزیہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی:

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ: یہ خدا کا نام ہے جو قرآن پاک میں بطور خاص علم کے ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں "خدائے برحق" کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس نئی تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیار دینے والے کے ہیں۔

الرحمٰن: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں۔ یہ گذر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا۔ عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا۔ قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں اور نیز اور مقامات میں اللہ اور رحمٰن کو ایک ساتھ ایک جگہ استعمال کیا ہے۔ بظاہر تو یہ وصف و موصوف کی معمولی ترکیب ہے مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو الگ مختلف اور جدا جدا ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں اور اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدت الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھے ہوئے تھیں۔

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى﴾ [اسراء ۱۲]

خدا کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جو چاہے کہو اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں۔

الرحیم: رحم کرنے والا۔ رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے جس سے بچے کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس لئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مادرانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔

الرحمٰن اور الرحیم خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ معمور ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہوا جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوگا وہ اس کی رحمانی اور رحیمی یا انہیں دو صفتوں کا ظہور ہے۔ اسی طرح دار آخرت عالم دونوں میں اسی کی انہیں دونوں صفتوں کا ظہور ہے اور ہوگا۔

الرب: پرورش کرنے والا یعنی ہستی کے ازلی نقطہ سے لے کر آخر منزل تک بڑھانے اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور تکمیل و ترقی کا سامان کرنے والا۔

اللطیف: لطف والا مہربان۔

الغفور: معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا۔

اَلْمُجِيْرُ: پناہ دینے والا۔

اَلْغَنِيُّ: جو تمام دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز کئے ہوئے ہے۔

صفات جلالی:

یعنی وہ تمام صفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی اور قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔

اَلْمَلِكُ وَالْمَلِيْكُ: بادشاہ، فرمانروا۔

اَلْعَزِيْزُ: غالب جس پر کوئی دسترس نہ پا سکے۔

اَلْقَاهِرُ وَالْقَهَّارُ: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

اَلْمُنْتَقِمُ: سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

اَلْجَبَّارُ: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے۔ جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

اَلْمُهَيْمِنُ: سب پر شاہد اور نگران و رقیب۔

اَلْمُتَكَبِّرُ: اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شَدِيْدُ الْعِقَابِ: سخت سزا والا۔

شَدِيْدُ الْبَطْشِ: بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ:

خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے۔ لیکن صحیفہ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک جاہل کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گذرتا ہے بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی و ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ (آل عمران۔ ۱۸۲)

بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عزیز (غالب) کے ساتھ حکیم (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا حال بھی لازمی طور پر سنایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ ﴿ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ وہیں یہ بھی کہا گیا ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴾ قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمایا گیا۔

﴿وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (مومن۔۳۱)

اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کی صفت ﴿ذُوْ عِقَابٍ اَلِیْمٍ﴾ "دردناک عذاب دینے والا" جہاں بیان کی گئی تو اس سے معاً پہلے ﴿لَذُوْ مَغْفِرَۃٍ﴾ یعنی بخشش والا (حم السجدہ۔۵) بھی فرمایا گیا۔ غرض صفات جلالی کے بیان میں یہ عام عادت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے پیچھے اس کی صفات جمالی کا بھی ذکر ہو تا کہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفات کمالی

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے اس کی خوبی' بڑائی' بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں دوسرے وہ جو اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں' تیسرے اس کے علم سے' چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہ اور پاکی سے۔

صفات وحدانیت:

یعنی وہ صفتیں جو اس کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

اَلْوَاحِدُ: ایک۔

اَلْاَحَدُ: ایک۔

اَلْوِتْرُ: طاق جس کا کوئی جوڑ نہیں۔

صفات وجودی:

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود' بقا' دوام' ازلیت اور ابدیت ظاہر ہوتی ہے۔

اَلْمَوْجُوْدُ: وجود والا' ہست۔

اَلْحَیُّ: ہمیشہ زندہ' غیر فانی۔

اَلْقَدِیْمُ: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہ ہو' جو ہمیشہ سے ہے۔

اَلْقَیُّوْمُ: جو اپنے سہارے قائم ہو کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اَلْبَاقِیْ: باقی جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

اَلدَّائِمُ: ہمیشہ رہنے والا۔

اَلْاَوَّلُ: وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

اَلْاٰخِرُ: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

اَلْمُقَدَّمُ: جو سب سے آگے رہے ہے۔

الْمُؤَخِّرُ: جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

الظَّاهِرُ: جس کا وجود کھلا ہوا نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

الْبَاطِنُ: وہ چھپا اور مخفی ہو (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

علم:

یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

الْخَبِيرُ: خبر رکھنے والا۔

الْعَلِيمُ: جاننے والا۔

عَلَّامُ الْغُيُوبِ: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

السَّمِيعُ: سننے والا۔

الْبَصِيرُ: دیکھنے والا۔

الْمُتَكَلِّمُ: بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

الْوَاجِدُ: پانے والا، جس کے علم کے سامنے کوئی چیز گم نہ ہو۔

الشَّهِيدُ: حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہ ہو۔

الْحَسِيبُ: حساب کرنے والا یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا۔

الْمُحْصِي: گننے والا یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد ان کا بھی جاننے والا۔

الْمُدَبِّرُ: تدبیر کرنے والا انتظام کرنے والا۔

الْحَكِيمُ: حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

الْمُرِيدُ: ارادہ کرنے والا مشیت والا۔

الْقَرِيبُ: نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت:

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

الْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ: ہر مشکل کو کھولنے والا۔

الْقَدِيرُ وَالْقَادِرُ: قادر قدرت والا۔

الْمُقْتَدِرُ: اقتدار والا جس کے سامنے کوئی چون وچرا نہیں کر سکتا۔

الْقَوِيُّ: قوی زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

اَلْمَتِیْنُ : مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

اَلْجَامِعُ: جمع کرنے والا متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

اَلْبَاعِثُ : اٹھانے والا مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اول۔

مَالِكُ الْمُلْكِ: سلطنت کا مالک، جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

اَلْبَدِیْعُ: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔

اَلْوَاسِعُ : سمانے والا جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اَلْمُحِیْطُ: جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطے سے باہر نہیں۔

اَلْمُحْیِیْ وَالْمُمِیْتُ: جلانے والا اور مارنے والا۔

اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ: نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

اَلْمُعْطِیْ وَالْمَانِعُ: دینے والا اور روک لینے والا۔

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا، یعنی نفع و ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِیْدُ: جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا کر دی گئی ہو اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

تنبیہ:

اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر برائی نظر آتی ہے جیسے الضار [نقصان پہنچانے والا] المذل [ذلت دینے والا] الخافض (پست کرنے والا) المانع [روکنے والا] وغیرہ ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا۔ یعنی خدا کو صرف الضار، الخافض، المانع اور المذل کہنا درست نہیں جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملا لیا جائے۔ یعنی الضار کے ساتھ النافع، الخافض کے ساتھ الرافع، المانع کے ساتھ المعطی اور المذل کے ساتھ المعز۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں یہ احتیاط برتی گئی ہے کہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک طرح کی برائی ہے۔ ہاں نقصان و نفع پہنچانے والا، عزت و ذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا دونوں کو ملا کر جب یہ توجیہ ہوگا اس سے مقصود اس کی قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں یا ایسا عزت دینے والا ہے جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو اس کے اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر اس کا مجبور مضطر ہونا ادا ہوتا ہے اور اس کی قدرت کا یہ کمال نمایاں نہیں ہوتا کہ وہ نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے

سکنے کے باوصف وہ عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہ

وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور بزرگی اور ہر عیب و نقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اَلعلیُّ	مرتبہ والا۔	اَلماجدُ :	عزت والا۔
اَلعظیمُ :	عظمت والا۔	اَلحمیدُ :	تعریف والا۔
اَلکبیرُ۔	بڑا۔	اَلقدوسُ :	پاک۔
اَلرفیعُ :	بلند۔	اَلحقُّ :	سچا اور اصل حقیقی یعنی اس کے ما سوا سب باطل ہیں
اَلجلیلُ :	بزرگ۔	اَلجمیلُ :	اچھا۔
اَلکریمُ :	شریف۔	اَلبرُّ :	نیک۔
اَلغنیُّ :	بے نیاز۔	اَلعدلُ :	عادل۔
الصادقُ :	سچا راست باز۔	سبوحٌ :	ہر عیب سے پاک۔
الصمدُ :	بزرگی کی ہر صفت میں کامل	الرشیدُ :	سیدھی راہ چلنے والا نہ بہکنے والا

ان تعلیمات کا اثر اخلاق انسانی پر:

خدا تعالیٰ کے ان اسماء و صفات کا عقیدہ دینی محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ محامد و اوصاف اخلاق انسانی کا معیار ہیں۔ ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں جتنے اوصاف و محامد انسان کے لئے قابل نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد و اوصاف سے دوری کی نسبت رکھتے ہیں اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے اور خدا کے ان اسماء و صفات کو محامد و محاسن اور خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل اور پیروی کی کوشش کرے۔ محامد الٰہی گویا استاد ازل کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہئے اس لیے انسان کو بھی اپنے ہر حرف کے لکھنے (محامد الٰہی کی تحصیل) میں ایک نظر اس استاد ازل کی وصلی پر بھی ڈالنی چاہئے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے۔

گذر چکا کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ آدم

﴿ اِنّی جَاعِلٌ فی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ﴾ (بقرہ)

آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔

خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور اتنا ہی وہ اصل سے زیادہ قریب ہوگا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کرے گا۔ یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ﴾ (بقرہ۔۱۷)

خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ اس "خدائی رنگ" سے مقصود خدا کا "دین فطرت" ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُورَتِهِ﴾ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزر چکی کہ اس صورت سے مقصود جسمانی نہیں معنوی شکل و صورت ہے۔ یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفات کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں حد بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور اخلاق و صفات میں ملاء اعلیٰ سے تشبہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصان خدا کے اس مقولہ

﴿ تخلقوا باخلاق اللّٰه ﴾

خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔

کا مطلب ہے حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ

﴿ حسن الخلق خلق اللّٰه الاعظم ﴾

حسن خلق خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی چار قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں۔ جلالی' جبروتی' کمالی اور جمالی صفت جلالی جن میں کبریائی' عظمت' شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں' اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی اور عبودیت کے رتبہ کے سزاوار ہیں۔ ان کا اقتضاء یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں یعنی عاجزی' تواضع' فروتنی اور خاکساری' اسی لئے ترفع' تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لئے آدم جس نے فروتنی' درماندگی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا' خلافت کی خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور کیا' دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

﴿ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ﴾ (بقرہ۔۴)

اس نے آدم کے سجدہ سے انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لئے ہے' اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں

﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (جاثیہ۔۴)

اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ہے۔

صحیح مسلم[2] میں ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت اور کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا" دوسری حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "خدا کے نزدیک سب سے برا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں"[3] ﴿ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ﴾ (حشر۔۳) اسی کی شان ہے البتہ اللہ تعالیٰ اپنی

1۔ کنز العمال ج ۲ ص ۲ بروایت حضرت عمار بن یاسر۔

2۔ کتاب الادب باب الکبر جلد ۲ صفحہ ۳۰۲ مصر۔

3۔ صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب۔

عزت جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے مگر اس نوازش پر بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے فتح و نصرت اور دنیاوی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرط عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سر نیاز اظہار بندگی کے لیے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت و جلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول اللہ ﷺ پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا۔ یہ ترتیب خود قرآن میں ظاہر کی گئی ہے۔

﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (منافقون)

اور عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے۔

حاکم میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں، وہ اپنی عزت و جلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہو معزز بننا چاہتا ہے تو یہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں یہ کہا جائے گا "اس کا مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا" (قرآن) اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو اس نے خدا کی اس چادر کا اتارنا چاہا جو خدا ہی کے لیے تھی۔ ۔

خدا کے صفات کمال میں سے وحدانیت اور چند ازلی و ابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے، صفات تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں ان کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے معین نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

صفات جمالی وہ اخلاقی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لیے حسب استعداد کھلا ہوا ہے ان صفات جمالی کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ "خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں" اسلام نے اس الٰہی تشبیہ کو جا بجا ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے ہاں یہ ہے کہ "اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے" آپ نے فرمایا "جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈال دے گا خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔" [2] قرآن کہتا ہے کہ "تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔"

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾ (نساء)

اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی کو معاف کر دو تو اللہ بھی معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی۔ ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی۔ سزا کا منظر دیکھ کر حضور کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ اشخاص نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا کہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا

---

1. کنز العمال جلد [illegible] صفحہ [illegible] بحوالہ مستدرک حاکم۔
2. صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ۔

کرو۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور عفو و درگذر پسند کرتا ہے تو تم بھی معاف اور درگذر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[1]

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ ”جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔“ ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا

﴿ان اللہ عزوجل جمیل یحب الجمال﴾ [2]

اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے۔ یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ ”خدا جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔“[3] یہ روایت بھی ہے ”خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے وہ سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے وہ صاف ستھرا ہے صفائی اور ستھرا پن کو پسند کرتا ہے۔“[4] ایک روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں ”وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے اچھے اخلاق والے سے محبت اور بداخلاقوں سے نفرت رکھتا ہے۔“[5] ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں ”اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔“[6] ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا ”لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔“[7] عام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا ”اے قرآن کے ماننے والو وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے وہ یکتائی (وتر) کو پسند کرتا ہے۔“[8]

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا (ابوداؤد، باب فی الرحمۃ)۔ رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں، آپ نے فرمایا کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے رحم جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا، جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاؤں گا۔“[9] ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ

---

1. مستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۲۸۲، کتاب الحدود۔
2. صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبر۔
3. کنزالعمال کتاب الصحبۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔
4. کنزالعمال کتاب الصحبۃ بحوالہ کامل ابن عدی۔
5. ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی۔
6. صحیح مسلم، ابوداؤد، حاکم، نسائی، ابن ماجہ باب الرفق فی الادب۔
7. صحیح مسلم کتاب الصدقۃ و ترمذی تفسیر سورۂ بقرہ۔
8. ابوداؤد باب استحباب الوتر۔
9. صحیح بخاری باب صلۃ الرحم۔

میں ہے: "میں خدا ہوں میں رحمان ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا۔ جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔"[1] پھر فرمایا جو انسان پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔[2] بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔[3] آپ نے فرمایا خدا نے رحم کے سو حصے کیے، ننانوے حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچے کے لئے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔[4]

بخل خدا کی صفت نہیں مگر آپ نے فرمایا "تم اپنی تھیلی کے منہ بند کر رکھو ورنہ تم پر بھی تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔"[5] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ "جو بندہ دوسرے بندے کی پردہ پوشی کرے گا قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا۔"[6] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو گے خدا تمہاری مدد میں ہے۔[7]

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے۔[8] اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا کہ "خدا بھی غیرت کرتا ہے اور مومن بھی غیرت کرتا ہے اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔"[9]

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے۔

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ (آل عمران۔ ۱۹)

وہ خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس لئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا۔

﴿ یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی و جعلته بینکم محرما فلا تظالموا ﴾[10]

---

1. ابواب البر والصلۃ۔
2. ترمذی باب مذکور۔
3. جامع بخاری باب رحمۃ الولد۔
4. ایضاً۔
5. صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ۔
6. مسلم کتاب البر والصلۃ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا بان یستر علیہ فی الآخرۃ۔
7. ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعونۃ للمسلم۔
8. صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۱۰۱۔
9. جامع ترمذی باب ما جاء فی الغیرۃ من ابواب النکاح۔
10. صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ، مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۱۶۰ و ادب المفرد بخاری باب الظلم ص ۹۵۔

اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے، ہاں تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں۔ اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا۔

﴿ان اللہ طیب یحب الطیب و نظیف یحب النظافة فتنظفوا و لا تشبهوا الیهود ﴾[1]

خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے، تم پاک وصاف رہا کرو اور یہودیوں کی طرح گندے نہ ہو۔

یہ توحید کا ایک رخ تھا۔ اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا تھیں انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا، وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی۔ بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ باطل (مصر) ہندو ایران کے خدا اور ﴿رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾ ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے۔ جن کا عزل و نصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند و پست، شریف و ذلیل، مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کوئی پیدائش پرمیشور کے منہ، کوئی اس کے ہاتھ اور کوئی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم و جبر اور غرور و فخر کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آ کر اس بلند و پست اور نشیب و فراز کو برابر کیا۔ سب انسان خدا کے بندے سب اس کے سامنے برابر سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں۔

بہرحال اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لئے وہ مساوات انسانی کے حقیقی جوہر سے بھی اب تک آشنا ہیں اور انجام یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوت درجہ کا خیال ان کے دل میں دور نہیں ہوتا۔ دولت و فقر اور رنگ و قومیت کے امتیازات خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے اس مساوات کی دولت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے ان مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں۔ دولت و فقر، رنگ و روپ اور نسل و قومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا۔ اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے۔

---

[1] ترمذی باب فی النظافۃ ص ۴۵۶۔

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۳)

تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہو۔

خدا کا ڈر اور پیار:

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے۔ عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار و جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے جس کی ہیبت و جلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہئے۔ اس کے گوشہ چشم میں لطف و عنایت کا گذر نہیں۔ محبت اور پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں۔ نہ وہ اپنے کمزور بندوں پر خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ وہ اپنے بندوں سے اپنے لئے محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات اوپر گذر چکے ہیں ان پر ایک ایک کر کے نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند نہ جلالی ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ اور مالکیت تامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام تر تمام صرف محبت پیار اور لطف و کرم، رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجوہات کے سبب مغالطہ ہوا۔

۱۔　آنحضرت ﷺ نے اللہ سے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

۲۔　دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں آپ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم:

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم میں محبت اور پیار کے ساتھ خدا کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو کہ انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہیں۔ خوف اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ آگے پیچھے بھی اور ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہیں۔ اولاد سے محبت کا نتیجہ نازنخرہ اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان محبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد خوف ہی کے جذبہ سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل کا تعلق نہ تنہا خوف سے ہو سکتا ہے نہ تنہا محبت سے انجام پا سکتا ہے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے اور یہی نبوت محمدی کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے ان میں اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی اور صراط مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سراسر خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا غیور کا سپہ سالار[1] اور باپ کا بدلہ پشت تا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔[2] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و

۱۔　[illegible]

۲۔　[illegible]

شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔[1] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور ہے گو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہیں بلکہ انجیل میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے۔[2] مگر ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے وہ نہ تو خدا کو محض جبار و قہار و رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے نہ اس کو مجسم انسان یا انسانوں کا باپ یا محمد ﷺ کا باپ کہتا ہے اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و رحیم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے عتاب بھی کرتا ہے اور نوازتا بھی ہے اس لیے اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے۔

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (اعراف۔۷)

(لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر چپکے چپکے پکارا کرو، وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے فضل و کرم کی لو لگاتے ہوئے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب ہی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا۔

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا﴾ (انبیاء۔۶)

وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ لطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا ہے تو اس کو جبار و قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

﴿وَخَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (یٰسین)

اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (قٓ)

جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبانیں اسی مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہیں۔

﴿وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَٰنِ﴾ (طٰہٰ)

اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔

دنیا میں جو پیغمبر آئے دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ

---

1. خروج ۲۰:۶ و ۳۴:۶ و زبور ۸۶:۵ و ۱۰۳:۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے۔
2. لوقا انجیل ۱۲:۵ و اعمال ۹:۳۱ [illegible] یہی تعلیم عیسائیت میں باقی رکھی گئی ہے۔

تھا۔ اس لئے وہ صرف خدا کے خوف وخشیت کی تعلیم دیتے تھے مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ۔ دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی محبت کی طرف بلاتے تھے مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور رعب دونوں کی جامع تھی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔ ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشکبار رہتی تھیں، دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم وکرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے تھے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق وولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور بے شمار آیتیں گذرتی جاتیں جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی، پناہ مانگتے اور جب کوئی امید ومحبت اور رحم وبشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔[1]

الغرض اسلام کا منصب اصلی یہ ہے کہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت بہک کر گرنے کا خطرہ ہے خوف وخشیت اور رحم ومحبت کے بیچ کی شاہراہ میں وہ انسانوں کو کھڑا کرے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

﴿الایمان بین الخوف والرجاء﴾

ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے۔

کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم وکرم سے ناامید اور تنہا رحم وکرم پر بھروسہ لوگوں کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے جیسا کہ ہم کو دنیا کے روز مرہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا۔ لیکن ساتھ ہی عاجز اور درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے فرمایا

﴿ورحمتی وسعت کل شیء﴾ (اعراف)

میری رحمت ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اور اسی کی تفسیر صاحب قرآنؐ نے ان الفاظ میں کی۔

﴿رحمتی سبقت غضبی﴾ (بخاری)

میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو فرزند الٰہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خاندان اور محبوب ٹھہرایا اور حضرت عیسیٰ کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزند الٰہی کا درجہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا قوم کو عطا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا۔

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۰۳

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ (مائدہ)

ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

﴿ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ﴾ (مائدہ)

اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے (اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہیں انسانوں میں سے ہو جس کو اس نے پیدا کیا۔

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (جمعہ-۱)

اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمت الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا' بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد نبوی میں آ کر دعا کی کہ "خدایا مجھ کو اور محمد کو مغفرت عطا کر" آپ نے فرمایا خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا[1] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا مجھ پر اور محمد پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر' آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا "یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ"۔[2]

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت:

اس سلسلہ میں تعلیم محمدی کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لئے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا' چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا' جیسا کہ عیسائیوں میں ہے دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا۔ اس لئے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی ماتائیں بنیں جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے۔ خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شوئی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پراثر منظر اور قابل

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب۔

[2] ابوداؤد کتاب الادب۔

قسمت میں کوئی دوسرا نہیں۔ اس لئے یہود کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شوئی کے مطالب سے ادا کیا گیا، سدا سہاگ فقرا اسی تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا وہ راہ سے بے راہ ہوگئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا اور لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہوگئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بعضوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑھیاں پہن لیں اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے۔ اسی لئے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی، اور خدا کے لئے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا۔ لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کا اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عابد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے بھی زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے۔

﴿ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (بقرہ)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

دیکھو کہ باپ کی طرف کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لئے ناکافی قرار دیتا ہے اور عابد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحمت و محبت کے اس جسمانی طریقہ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عابد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے۔ اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں۔ انسانوں کے تمام خیالات و تصورات ان مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں اس لئے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے لئے ان کی لغت کا ایسا لفظ مل سکتا ہے جو غیر کسی مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا شائبہ تک نہ ہو۔ انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے اور اسی طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینے میں اتر جاتا ہے۔

اس "ان دیکھی ہستی" کی ذات و صفات کے متعلق جس کو ہم خدا کہتے ہیں ہر مذہب میں ایک تخیل ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد و پیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے جہاں تک نوع انسان کے لئے ممکن ہے۔ خدا کے متعلق باپ، ماں اور شوہر کا تخیل اسی درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے اسی لئے نبوت محمدی نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا۔ ہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرتے ہیں

اس لئے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لئے اسلام نے مستعار لے لیا، اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر اس نے ربط و تعلق کا اظہار کیا اور انسانوں کو استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آ چکی تھیں ان سے ان کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بناء پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے۔ اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے گئے ہیں ہر قوم نے اس علم اور نام کے لئے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی ہے۔

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے۔ اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلَهَ سے نکلا ہے اور وَلَهٌ کے اصل معنی عربی میں اس غم، محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے اسی سے بعد میں مطلق ''عشق و محبت'' کے معنی پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ وَالِہٗ (شیدا) مستعمل ہے۔ اس لئے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں متحیر اور پریشان ہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے اللہ کا ترجمہ ہندی میں وہ ''من موہن'' یعنی دلوں کا محبوب کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رحمٰن اور رحیم ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی رحم والا، مہربان، لطف و کرم والا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (یعنی مہربان محبوب رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہیں صفات ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل مطلوب ہے۔ لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ رحمان ہے جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے۔

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ (بنی اسرائیل)

اس کو محبوب (اللہ) کہو یا مہربان (رحمان) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صد بار کی تکرار کو چھوڑ کر ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک حرف ہماری نظر کے سامنے سے گزر چکا ہے۔ ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود سورہ ذات البروج میں آیا ہے جس کے معنی ''محبوب'' اور ''پیارے'' کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے۔

اس کے سوا خدا کا ایک اور نام "الودود" ہے جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں۔ خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے "رؤوف" ہے۔ "رؤوف" کا لفظ "رافت" سے نکلا ہے "رافت" کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کا ایک اور نام "حنان" ہے جو حنن سے مشتق ہے "حنن" اور "حنین" اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ یہ الفاظ ان مجازی اور ان مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے رشتہ و تعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں۔ دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں کے درمیان محبت اور پیار کے جو خاص جذبات ہیں ان کو خدا کے لئے بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس طرح مادیت و جسمانیات کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تحسین کرتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے۔ جو بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا وہ سلام (امن و سلامتی) ہے کہ وہ سراپا اپنے بندوں کے لئے امن و سلامتی ہے وہ مؤمن (امن دینے والا) ہے۔ وہ عدل یعنی سراپا انصاف ہے غفور (معاف کرنیوالا) ہے۔ الوھاب (عطا کرنیوالا) الحلیم (بردبار) شکور (بندوں کی کوتاہیوں پر صبر کرنیوالا) التواب (بندوں کے حال پر رجوع کرنیوالا) البر (نیک اور مجسم خیر) اور المقسط (منصف اور عادل) ہے ان میں ہر لفظ پر غور کرو اور دیکھو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

تورات کے اسفار انجیل کے صحیفوں اور ہندوؤں کے ویدوں کے صحف کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے پر محبت اور سراپا مہر و کرم اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطف احسان اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے خالی ہے جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک و کفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سراپا روحانی معنوں کو مادی اور جسمی یقین کر لیتے ہیں اور اس لئے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا ہو روحانی حقائق کی تعبیر کے لئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو استعارات کی لغزشوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان ولولہ آمیز اور ولولہ انگیز خیالات سے معمور ہیں۔ البتہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب (باپ) کی بجائے "رب" کہہ کر پکارتا ہے وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

''اَب اور رَبّ'' ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمع نظر سے کس درجہ پست ہے'اَب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بناء پر ایک خاص لحظ میں قائم ہوتا ہے'اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں وہ بچپن کے ایک محدود عرصے تک قائم رہتا ہے'اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے'مگر یہ تعلق صد درجہ ناقص'محدود اور فانی ہوتا ہے' بیٹے کے وجود' قیام و بقاء'ضروریات زندگی' سامان حیات' نشوونما' اور ارتقاء' کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ اپنے باپ سے الگ' مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے' مگر ذرا غور کرو' کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو رابطہ و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے' کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے' کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے۔

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک اور پیدائش سے وفات تک' بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہو سکتا' جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے' وہ گہوارۂ عدم سے لے کر تائے عمل کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے۔ انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا' قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون' مضغہ گوشت ہو یا مشت استخوان' شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر' بچہ ہو یا جوان' ادھیڑ عمر ہو یا بوڑھا' کوئی آن' کوئی لمحہ رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت' جسمانیت' ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے'اس سے رب یک قلم پاک ہے'اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے'اور وہ محبت الست کی سرشاری کی یاد بھولے ہوئے انسانوں کو کس طرح دلا رہا ہے'اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے'ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت ''حب الٰہی'' ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی' زبان الٰہی نے شہادت دی۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ (بقرہ)

جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

اس نشۂ محبت کے سامنے باپ' ماں' اولاد' بھائی' بیوی' جان و مال' خاندان سب قربان اور نثار ہو جانا چاہیے' ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ (توبہ-۳)

اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے تمہارے بھائی تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ سنائے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے۔ چنانچہ جو لوگ کہ راہ حق سے بھٹک جاتے تھے ان کو پکار کر سنا دیا گیا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ﴾ (مائدہ)

مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

حضرت مسیحؑ نے کہا "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے، اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں۔ تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا۔ اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے۔

﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (آل عمران)

اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

محبت کے ثمرہ حاصل ہونے کی تمہید سے اس مرتبہ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴾ (مریم)

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے رحمت والا خدا ان کے لئے محبت پیدا کرے گا

اس آیت میں محبت کے حصول کے ذریعے دو بتائے گئے۔ ایمان اور عمل صالح یعنی نیک کام چنانچہ صفات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان خوبیوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (مائدہ)

خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ﴾ (بقرہ)

خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴾ (آل عمران)

خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (مائدہ، حجرات)

خدا انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (توبہ)

خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ﴾ (صف)

خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ (آل عمران)

اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ (توبہ)

اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا۔ محبت ان سے کرتا ہے جو خدا کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں، اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لئے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لئے بستر لگاتا ہے تو وہ وضو کر کے خدا کی یاد کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔[1]"

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم ہے اور دوسرے کا نام خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف یہی وہ دو کانٹے ہیں جو عاجز و درماندہ انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہتے ہیں، لیکن جو محبوب حق کے منصب کا اہل اور اس کے والا و شیدا ہیں ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن ان خارزاروں سے پاک ہوگا۔

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (یونس)

ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے اس کا نام "رحم" اور "رحمت" ہے۔ اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمان و رحیم ہے۔ جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو۔ اسی لئے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتا ہے۔ گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر تسلی کا پیام بھیجتا ہے۔

﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (زمر)

---

[1] مسند ابن حنبل مسند ابوذر جلد ۵ صفحہ ۱۵۱

پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے، بے شبہ وہی بخشش کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت سنانے آئے ہیں تو کہتے ہیں۔

﴿ فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَانِطِينَ ﴾ (حجر)

تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبۂ عطوفت محبت سے مافوق ہے۔ اس لئے جواب دیا۔

﴿ وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴾ (حجر)

"اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون ناامید ہوتا ہے۔"

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی، مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں، من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، وہ گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، وہ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور ہے، رحمان و رحیم ہے، رؤف و ودود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے اور اپنے اوپر اس کو فرض کر دیا ہے۔

﴿ كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (انعام)

اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

قاصد نبوت کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ان کا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے۔

﴿ وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ (انعام)

اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان کو کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر تو خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے نادانی سے برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد وہ اس کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بے شبہ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں۔

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (اعراف)

اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے۔

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو اس نے اپنے دست خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی۔ جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عذاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو

وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے۔ بارگاہ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں' مجھے پرواہ نہیں' اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کر دوں خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مجھے پرواہ نہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو' پھر تم ہمارے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا [1] کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت اس محبت اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے۔

حضرت ابو ایوب ؓ صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی کہ وہ اس کو بخشتا۔" [2] یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں' مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں' جن کی بنا پر دوستوں' عزیزوں' قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رحم و محبت ہے اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ شاندار مناظر نظر آتے ہیں' تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایہ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا' جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں" [3] اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا' صحابہ نے تنگ آ کر کہا "خداوند! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔" رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی۔ فرمایا "اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت [4] ہے" تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لئے بھی خدا کی محبت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا' خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور اس ذات الٰہی کے ساتھ اپنی وابستگی' محبت اور سرشاری کے لطف سے ان کو کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا۔ بلال ؓ کو دیکھو ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت میں ان کو لٹایا جاتا ہے۔ ایک گرم پتھر ان کے سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لئے ان کو مجبور کیا جاتا ہے اور وہ یہ سب تکلیفیں اٹھا رہے ہیں مگر زبان پر صرف

---

[1] جامع ترمذی (ابواب الدعوات) و دیگر کتب احادیث صحیح۔

[2] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۱۴۔

[3] بخاری کتاب الادب صفحہ ۸۸۹۔

[4] بخاری کتاب الحدود باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر صفحہ ۱۰۰۲۔

ہے۔ تاہم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا، جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے ارشاد ہوا۔ فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا۔ صحابہ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔[۱]

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریل سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔[۲]

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے راوی ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "بندہ اپنے اعمال نفل سے میری قربت کی تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے"[۳] یہ دولت یہ نعمت یہ سعادت آستانہ محمدی کے سوا کہیں اور نہیں تھی۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے وہ نیکی کی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔"[۴] یہ قابل رشک رتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ "ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔"[۵]

یہ محبت الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ میں نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو۔"[۶] یہ عشق و محبت کی دعوت محبوب ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب حبیب خدا ہے۔ دیکھو کہ حبیب و محبوب میں علت و محبت کے کیا کیا رنگ

---

۱ مسلم کتاب الادب باب المرء مع من احب، بخاری کتاب الادب و باب ما جاء فی قول الرجل ویلک۔

۲ مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبدا حببہ۔

۳ بخاری کتاب الرقاق باب التواضع۔

۴ اس کی ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں دیکھو مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ فصل ثانی۔

۵ مشکوٰۃ باب مذکور۔

۶ مشکوٰۃ مناقب اہل بیت بروایت ترمذی۔

ہے' جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے' اپنی جان بچا رہا ہے۔ بھائی بھائی سے، ماں بچے سے، بچہ ماں سے' الگ ہے۔ اسی حال میں ایک عورت آتی ہے جس کا بچہ میدان جنگ میں گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے اپنے بچہ کے جوش محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے' اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے۔ رحمتہ للعالمین کی نظر پڑتی ہے۔ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں' "کیا یہ ممکن ہے یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے آگ میں ڈال دے" لوگوں نے عرض کی' "ہرگز نہیں" فرمایا "تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے" ۱؎

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں' ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے' کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا ہاں' بے شک اس سے زیادہ ہے' بولی "تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی"۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا' پھر سر اٹھا کر فرمایا' خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔ ۲؎

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں' ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے باندھ کر لاتے ہیں اور واقعہ عرض کرتے ہیں کہ "یا رسول اللہ میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا' ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی' میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آ کر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی" ارشاد ہوا "کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے' قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا' جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے' خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے"۔ ۳؎

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں' محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگاتے جاتے تھے' آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے' انہوں نے کہا ہاں' فرمایا "تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے' جتنی تم کو اس بچہ سے ہے' وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے"۔ ۴؎

جمال حقیقت کا پہلا مشتاق اور مستور ازل کے زیر نقاب چہرہ کا پہلا پردہ کشا' زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے' مرض کی شدت ہے' بدن بخار سے جل رہا ہے' اٹھ کر چل نہیں سکتا' لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے' مسجد نبوی میں جان نثار حاضر ہوتے ہیں' سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں' نبوت کے آخری پیغام کے سننے کی آرزو ہے' دفعتہ لب مبارک ہلتے ہیں' تو یہ آواز آتی ہے "لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی براءت کرتا ہوں کہ انسانوں

۱؎ صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد۔

۲؎ سنن ابن ماجہ باب ما یرجی من الرحمۃ۔

۳؎ مشکوٰۃ بحوالہ ابو داؤد کتاب الاسماء باب سعۃ رحمۃ اللہ۔

۴؎ ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص ۵۵ مصر۔

میں میرا کوئی دوست ہے تو مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے جیسا کہ ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا"۔ [1] یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں بھی زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا "خداوندا! اے بہترین رفیق" [2]

خدا تعالیٰ کی کریمی و رحیمی، اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گنہگار بندوں کے ساتھ اس کی شان بخشش کا ترانہ خود محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے کانوں سے سنا اور دوسروں کو حرف بحرف سنا کر دلوں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمینؐ نے یہ پیام ربانی ہم کو سنایا۔

"میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی تو مجھ سے راستہ پوچھو میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا، لیکن جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا، لیکن جس کو میں نے پلایا تو مجھ سے پانی مانگو میں تم کو پلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا، لیکن جس کو میں نے پہنایا تو مجھ سے کپڑا مانگو میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، جن اور انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا۔ اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت سب دنیا کے سب سے بڑے گنہگار کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ایک ذرہ برابر کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی، لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈال کر نکال لی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔" [3]

یہ محبت کا نغمہ ازلی دنیا نے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان مبارک سے سنا، تسلی و تشفی کا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، یہ لطف و کرم کے بحر بیکراں کا یہ ساحل اسے آپ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا، اور گنہگاروں کو "میرے بندو" کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ کے وسیلے سے ملی ﷺ۔

---

1. صحیح مسلم کتاب المساجد۔
2. صحیح بخاری ذکر وفات نبوی۔
3. مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۵۴ و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵۔ مسلم نے بھی یہ روایت سامنے رکھی ہے لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر جوڑ دیئے ہیں اس سے بعض بعض ٹکڑے انہی میں بھی ملتے ہیں اور کچھ تینوں (۱۳۵۰) کی روایتوں کے ملانے سے لفظی و کامل ترجمہ بن سکتا ہے جو کسی ایک میں ادا نہیں ہو سکتا ہے۔

فرشتوں پر ایمان

ملٰئکہ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے' اس کا واحد ملک' ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے' اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں' اسی لئے قرآن پاک میں ملائکہ کے لئے رسل کا لفظ بھی آیا ہے' جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں' ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں' جو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں' اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کے انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں' اور چلا رہے ہیں۔ یعنی وہ خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان اس حیثیت سے پیام رسانی اور سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القاء کرتا ہے' اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں' ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے' اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے ایک سر مو تجاوز نہیں کرتے' گویا ان کی خلقت ہی صرف اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے کی گئی ہے' دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے' وہ انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے' اور خدا انبیاء پر اپنے جو احکام اتارتا ہے' یا ان سے ہم کلام ہوتا ہے' وہ انہیں کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے' صابی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں' یونانی' مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام "عقول عشرہ" (دس عقلیں) رکھا گیا ہے' اور ساتھ ہی نو آسمانوں میں بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کئے گئے ہیں' بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردہ کا پتہ لگتا ہے' جن میں سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے' جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی خلق کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے' اور جس کو اہل فلسفہ عقل اول سے تعبیر کرتے ہیں' پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام "امشاسپند" ہے' اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے' یہودی ان کو "وہم" کہتے ہیں' اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھے ہیں' عیسائی بھی ان کو انہیں ناموں سے یاد کرتے ہیں' اور جبریل وروح القدس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں' ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں' جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے' بہرحال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام اور تعبیریں ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں' اور وہ جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں جو صانع ومصنوعات اور خالق ومخلوقات کے درمیان اس کے حکم سے عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی' وہ کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں' اور کبھی وہ خدائی کے مرتبہ تک بھی بلند کردی جاتی تھیں' ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی صورت تھی' پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی تھی' کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں' اور کبھی خدا امشاسپندوں میں سے ایک ہو جاتا تھا' ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش بھی جاتی تھیں' ان کے نزدیک

سب سے عالی رتبہ امشاسپند تھے اور ان کے تحت میں ۳۳ نگران، ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ وہ نیکی اور بدی کے دو مستقل خداؤں کے قائل تھے اس لئے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے براہ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں، بلاکتوں، بدیوں اور ناپاکیوں کو پیدا کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے وہ ان اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے تھے اور دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پیادوں کو لے کر باہم نبرد آزما رہتے تھے، پھر بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا فرشتہ کے ساتھ ایک جوڑی یعنی مادہ فرشتہ بھی ہوتی تھی جو اس کی بیوی ہوتی تھی، ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیویوں کا تصور تھا، مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، یہودیوں میں ان فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی بلندی و شان و صفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی، اس کے آگے جھکا جاتا تھا اور اس کو خداوند کہہ کر اس طرح خطاب کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ مشتبہ ہو جاتا ہے کہ یہ خدا کا بیان ہے یا فرشتہ کا (تکوین ۱۶-۱۳، ۱۸-۲، ۳-۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے (تکوین ۶-۲) عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صابئین میں ان فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی، ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے، ان کو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے دیوی سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے اور ان کی پرستش ہوتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہو سکتے ہیں، یونانیوں میں عقل اول اور عقول عشرہ تمام عالم کے خالق و کارفرما و مرجع کل مانے گئے اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آکر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنا دیے گئے، ان کی پرستش و عبادت قطعاً ناجائز کی گئی، نر و مادہ کی مادی جنسیت سے پاک کئے گئے، اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد و شمار و درجات بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا، ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی، جس کا شب و روز کا مصرف آقا کا حکم بجا لانا ہے، عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا، اور نہ نیکی و بدی کی دو قسمیں کی گئیں، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیئے گئے، قرآن میں ان کی ہستی صرف اس حیثیت سے تسلیم کی گئی کہ یہ غیر مادی اور روحانی مخلوقات ہیں، جن کا کام خدا کی ہمہ تن اطاعت و فرمانبرداری ہے اور خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں، اور اس کے حکم کے مطابق وہ اس کی مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہے ہیں، لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، اسی لئے قرآن پاک نے ان کا خطاب یہودیوں کی طرح "خداوند" نہیں ٹھہرایا، نہ پارسیوں کی طرح ان کو "قابل پرستش" کے لقب سے ملقب کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا اور دیوی کہا، بلکہ صرف "ملک" اور "رسول" کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغامبر، رسال اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغاز خلقت انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں وہ صلاحیت ہے کہ وہ ملائکہ کا مسجود بنے، اور وہ مرتبہ علم میں ان سے فوق ٹھہرایا گیا، خدا کی جس تسبیح و تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا اس کے باوجود جب انسان کا جوہر حقیقت انہوں نے دیکھا تو یہ

تسلیم کرنا پڑا کہ

﴿ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴾ (بقرہ۔۳۲)

تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا' بے شک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا' انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرف مطلق قرار دیا تھا' اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے اور یکساں عاجز و درماندہ ہیں' انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت خاص بخشی گئی کہ اپنے نفع و نقصان کے لئے ان سے کام لے سکیں' اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا کہ وہ آسمان و زمین اور پوری مملکت الٰہی میں اس کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جو ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے لوگ انہیں ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں' مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے' اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود اس آگ میں جلانے کی طاقت ہے' لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں' مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود اسی آگ کے اندر ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمران ہے' اور وہ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھک جاتے ہیں' اسلام کے نظریہ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا' اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العالمین اور فرمانروائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں' اسی کے آگے جھکنا چاہئے اور اسی کی بندگی کرنی چاہئے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے' جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں' ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور ان اسباب و علل کو جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے ہیں' اور جن کو بت پرست دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں' ان کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے ہیں اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے' جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں' جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے' اس لئے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ یہ خلاف عقل ہے' بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے' وہی یہاں بھی کارگر ہے' اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب و علل کا مسئلہ عقلاء میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے' اور یہ معمہ آج بھی اسی طرح لاینحل ہے' جس طرح پہلے دن تھا' اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے' اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے' اس لئے اگر محض ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت ارباب مذاہب نے نکالی ہے تو وہ محل اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ وہ خلاف عقل کہی جا سکتی ہے' کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل و اسباب کار فرما ہیں' اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل و اسباب بھی

ساتھ ساتھ کارفرما ہیں ان دونوں قسم کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود اسباب کے کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام "بخت و اتفاق" رکھتا ہے حالانکہ مسئلہ علل و اسباب کو ماننے کے بعد بخت و اتفاق کوئی چیز نہیں ان روحانی علل و اسباب کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے اس نظام عالم کو چلا رہے ہیں ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکماء کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب و علل کے "قوائے طبعی" سے کرتے ہیں اور ہم "قوائے روحانی" سے۔

اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص اور طبائع اور اس مادہ کی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول و قوانین موجود نہیں ہے اور نہ یہ منشا ہے کہ خود اشیا اور مادہ کے ذرات کے اندر کوئی خواص و طبائع اور مادہ کے اجزائے عنصری کے اندر بالطبع کوئی اصول ودیعت نہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص و طبائع اور اصول و قانون مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کو انہیں اصول و طبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔

سمجھنے کے لئے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے مخلوقات کی دو قسمیں ہیں ذی روح اور غیر ذی روح ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال و حرکات اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں ذی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ و ریشہ پر حکمران اور مسلط ہے تاہم وہ روح اصول مقررہ کے تحت ہی ان اعضاء سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی اسی طرح غیر ذی روح اشیاء پر ابر و باد سے لے کر دریا پہاڑ، سورج اور چاند تک پر بھی ارواح مقرر ہیں جو ان اشیاء سے خدا کے اصول مقررہ کے اندر یکساں افعال و حرکات کا صدور کراتی ہیں جس طرح ہماری روح اپنے اعضاء اور اعضاء کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ اشیاء کے مقررہ خواص و طبائع ہی کے سہارے کرتی ہے اسی طرح ملائکہ بھی انہیں مقررہ خواص و طبائع کے ذریعہ ہی اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکم الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح و نفوس واسطہ ہیں اسی طرح تمام عالم مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکم الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوس مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں مگر ہمارے اور عالم کائنات کے تمام نوعی افعال میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ انسان نے ارادہ پا کر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعال اختیاری کی ذمہ داری باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیان کر کے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہو کر صرف اطاعت فرمانبرداری اور انقیاد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اس لئے ان میں عصیان تمرد سرکشی اور حکم الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے اسی بنا پر اشیاء کے افعال و حرکات و خصائص میں

یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے اور یہی فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورت میں آکر نئے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن جاتا ہے۔

۱۔ اب ہم کو تعلیمات نبوی یعنی آیات و احادیث سے ملائکہ کی حقیقت کو روشن کرنا چاہئے۔ ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور ان میں ان کا بے اختیار ہونا ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے

﴿اللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۗ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ (حج۔ ۱۰)

خدا چن لیتا ہے فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رسان اور قاصد منتخب کرتا ہے، بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے، جو ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور و انتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے۔

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۚ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۖ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (فاطر۔ ۱)

حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار پروں والے پیام رسان بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کے لئے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہ غالب دانا ہے۔

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ یہ ملائکہ سفارت اور رسالت کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہی ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید میں ہے کہ ان فرشتوں دیوتاؤں کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ بھی ہے، یا وہ پرستش کے قابل بھی ہیں، یا ان کی دہائی بھی پکارنی چاہئے۔

۲۔ ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں، سورۂ انفال میں ہے۔

﴿إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (انفال۔ ۲)

یاد کر جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مسلمانوں کو ثابت قدم رکھو

﴿تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ﴾ (قدر۔ ۱)

اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر پہنچا کرتے ہیں۔

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں، اسی طرح دربار الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں۔

﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ﴾ (معارج۔ ۱) فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔

موت کے وقت روح کا قبض کرنا انہی سے متعلق ہے۔

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ ﴾ (سجدہ)

کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے وہ تم پر موت طاری کرے گا۔

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾

[انعام۔۹۳]

اور اگر تو دیکھے جب ظالم موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (انفال۔۷)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔

اس کے ہم معانی اور بھی کئی آیتیں ہیں ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت وفنا کی تدبیر علل و اسباب کی انہی روحانی ہستیوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود و انقلاب وفنا کے لئے کسی ایک علت وسبب کا وجود کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل و اسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں یہ متعلقہ علل و اسباب کا توافق اور موانع کا انسداد تدبیر ہے یہ تدبیر بحکم الٰہی ان ملائکہ کے سپرد ہے[1] اسی لئے کبھی اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے یدبر الامر (وہ کام کی تدبیر کرتا ہے) اور کبھی ان کو ملائکہ کی طرح منسوب کرتا ہے۔

﴿ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴾ (نازعات۔۱)

قسم ہے (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی) گرہوں کو کھول دینے والوں کی قسم ہے (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی پھر دوڑ کر (ذی اسباب وعلل پر) آگے بڑھ جانے والوں کی پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی

۳۔ یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان کی سفیر ہیں۔

﴿ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِىَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ﴾ (شوریٰ)

یا خدا آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ وہ ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

﴿ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾ (نحل)

خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔

خاص آنحضرتؐ سے متعلق ہے۔

﴿ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ)

---

[1] [illegible] کتاب [illegible] باب [illegible] میں [illegible] ہے [illegible] ہے۔

﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (انبیاء-۷)

نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کو آگے بڑھ کر استقبال کریں گے کہ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۔ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (فصلت)

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔

﴿هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ﴾ (احزاب)

وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ﴾ (احزاب)

اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔

﴿وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَن فِي الْأَرْضِ﴾ (شوریٰ)

اور جو زمین میں ہیں ان کے لئے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں۔

﴿أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (آل عمران-۹)

ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر خدا اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (بقرہ)

جو کفر کی حالت میں مر گئے ان پر خدا کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

۷۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے ذریعہ انجام ہوگا۔

﴿وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۔ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ﴾ (زمر)

اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے۔

﴿وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۔ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ﴾ (زمر)

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے

پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے دربان کہیں گے تم پر سلامتی ہو خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (رعد)
جنتیوں پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو تمہارے صبر کا بدلہ، پس کیا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔

﴿ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ ﴾ (تحریم)
دوزخ پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں۔

﴿ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ﴾ (مدثر)
ہم نے دوزخ کا مالک کار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے حاضر باش ہیں۔

﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ (زمر)
اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کئے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں مصروف ہوں گے۔

﴿ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى ﴾ (صافات)
ملاء اعلیٰ کے دربار کی باتیں شیاطین نہیں سن سکتے۔

﴿ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ (ص)
مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ بحث کرتے ہیں۔

قیامت کے دن بھی یہ تخت الٰہی کے حوالی اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجا لانے کے لئے تیار رہیں گے۔

﴿ وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴾ (حاقہ)
اور فرشتے زمین کے کناروں پر کھڑے ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔

﴿ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ (فجر)
ہرگز نہیں جبکہ زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تیرا رب تجلی فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ﴾ (نبا-۳۸)
جس دن روح اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔

۹۔ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کی تسبیح و تقدیس اور حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے ہیں۔ یہ ہی وہ خدا کے حضور میں اہل زمین کے لئے عموماً اور نیکوکاروں کے لئے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں۔

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (شوریٰ-۱)

اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشش کی دعا مانگا کرتے ہیں خبردار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔

یعنی یہ معلوم ہو کہ ان کی دعا ہی رحمت و برکت کا وسیلہ سبب ہے بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دست اختیار میں ہے۔

﴿ الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا ﴾ (مومن۔ ۱)

جو فرشتے عرش کو اٹھاتے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں وہ سب اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

﴿ وَلَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَنْ عِندَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ۝ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ﴾ (انبیاء۔ ۲)

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اس کی عبادت سے گھمنڈ نہیں کرتے اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں، رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سست نہیں پڑتے۔

﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۝ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴾ (انبیاء۔ ۲۶-۲۸)

بلکہ وہ معزز بندے ہیں جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں .... اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔

﴿ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴾ (تحریم)

خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے اس میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے

﴿ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ﴾ (رعد)

اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

﴿ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴾ (نحل۔ ۶)

اور آسمانوں میں اور زمین میں جتنے چلنے والے اور فرشتے ہیں وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے

گزر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذاہب اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے ان اعتقادات میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ کی رو سے عقل اول کی اضطراری پیدائش اور وجود کے بعد خدا کو معطل ٹھہرا کر فرشتوں کو عقول کی صورت میں اسی کا قائم مقام قرار دے دیا گیا تھا عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے اور انہیں کو عالم کا فرمانروا جانتے تھے یہود بھی ان کو کسی قدر

صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور ان کو کبھی کبھی خداؤں کا درجہ دے دیتے تھے جیسا کہ تورات (صحیفہ تکوین ۶: ۲، ۴ اور ۱۸: ۲ اور زبور ۲۹) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے جہاں کروبی "خدا کے بیٹوں" کے خطاب سے بھی کبھی یاد کرتے تھے (تکوین ۶: ۲) یعنی خداؤں میں وہ دیوتا اور دیوی تھے کہ ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف وہ اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے "چھوٹے خداؤں" کے مرتبہ پر بھی فائز تھے عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا عربوں کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور یہ سمجھتے تھے وہ ان کی پوجا کرتے تھے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے تعلیم محمدی نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں وہ صرف خدا کی اطاعت اور عبادت اور اس کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو جو کام سپرد ہے وہ اسی کو انجام دیتا ہے وہ ہماری طرح بندے ہیں اور عبادت کے مستحق نہیں اور نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے وہ کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے قرآن نے ان دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں نہ وہ مرد ہیں نہ عورت ہیں نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ وہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۝ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ۝ وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ﴾ (انبیاء ۲۶-۲۹)

مشرکوں نے کہا کہ رحمان خدا نے اولاد بنا لیا ہے وہ اس سے پاک ہے بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں خدا ان کے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اسی کی جس کے لئے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔

﴿إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝ لَّن يَسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ أَن يَكُونَ عَبْدًا لِّلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ وَمَن يَسْتَنكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا﴾ (نساء ۱۷۱-۱۷۲)

خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ملکیت ہے اور خدا کافی وکیل ہے مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ مقرب فرشتوں کو اس سے عار ہے اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے ان سب کو وہ اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا اور انہوں نے کھایا (تکوین ۱۸۔۸) لیکن قرآن پاک نے اسی قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی کہ وہ ان انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا مگر

﴿ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴾ (ہود۔۷)

جب ابراہیم نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے، اور دل میں ذرا انہوں نے کہا ڈریئے نہیں ہم لوط کی قوم کی طرف (ان کی تباہی کرنے کے لئے) بھیجے گئے ہیں۔

کفار قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا اس کے جواب میں کہا گیا

﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ﴾ (انعام۔۱)

اگر ہم پیغمبر فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیوں کے لئے) اس کو آدمی ہی بناتے تو جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے اس میں وہ پھر بھی پڑے رہتے (یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو بلکہ آدمی ہو)

اس آیت اور دوسری آیتوں میں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے تاہم وہ کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت مریمؑ وغیرہ کے قصوں میں ہے۔

﴿ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴾ (مریم)

وہ فرشتہ ایک ٹھیک ٹھاک بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔

اور یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو ان کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لئے دعوت کا سامان کیا مگر یہ دھوکا جلد دفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندوں کی ہے جب تک اس کی تصریح نہ ہوتی عقیدۂ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص وطبائع کو دیکھ کر مادہ پرست انہیں مادی خواص وطبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں اس کا ازالہ کیا جائے کیونکہ یہی چیز ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے، درحقیقت ان مادی خواص وطبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظام عالم اس کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات موثر نہیں بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ ان کو موثر بناتا ہے، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان نظام وشرائع کا نزول اور قدرت الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواح مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

وَرُسُلِهٖ

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے آنحضرت ﷺ کے وجود مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کے لئے وہی منتخب کی گئی ہے اور اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے یہ ملک خواہ مصر و یونان ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ صرف اپنے ہی کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کی مستحق سمجھتی تھی لیکن تعلیم محمدی نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت میں بدل دیا آپ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں۔ نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے[1] ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں آپ نے فرمایا "لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدم) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا[2] اس طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ روپ، ملک، حسب و نسب اور زبان سے نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری سے ہے۔[3]

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہو گئی دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساوات انسانی کا راستہ صاف ہو گیا بنی اسرائیل جن کو اپنے خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا تعلیم محمدی نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔

﴿ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ﴾ (مائدہ)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف ہمارے ہی خاندان کا ورثہ ہے جس طرح اہل آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف سنسکرت کے رشیوں اور منیوں نے سنی اور وہ صرف وید کے اوراق میں محفوظ ہے اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی جگہ یہی خیال تھا اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف عدل و کرم اور اس کی رحمت عام کے منافی قرار دیا اور کہہ دیا۔

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ (جمعہ)

یہ نبوت اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔

---

1. مسند احمد ابن حنبل از ابو نضرہ تابعی۔
2. جامع ترمذی آخر کتاب المناقب۔
3. قرآن الحجرات، عنوان اخوت دیکھو۔

﴿قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ أَن يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ (آل عمران۔ ۷۳-۷۴)

کہہ دو کہ ہدایت اللہ کی ہے (اسرائیلی علماء اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ) جیسا دین تم کو دیا گیا ہے کسی اور کو دیا جائے یا وہ (یعنی نئے دین والے) تم سے خدا کے آگے جھگڑیں کہہ دو کہ یہ نبوت کا فضل خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر وسیع ہے اور وہ اپنی مخلوق کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے وہ بڑا فضل والا ہے۔

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ (بقرہ۔ ۱۰۵)

اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے معلم یا پیغمبر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔

بعثت محمدی سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے نا آشنا تھی ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا بھی مستحق نہ سمجھا ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا۔ زردشت نے پاک نژادان ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوہ و قدرت سے محروم یقین کیا بنی اسرائیل اپنے خاندان کے سوا کسی اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کرتے تھے عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لئے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں اس کی نگاہ میں عرب و عجم اور شام و ہند سب برابر ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی بصیرت افروز آنکھوں نے جب پیغمبرانہ روئے زمین پر ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ﴾ (یونس)

اور ہر قوم کے لئے ایک رسول ہے۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا﴾ (نحل)

اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ﴾ (روم)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی قوموں میں بھیجے۔

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (رعد)

اور ہر قوم کے لئے راہنما ہے۔

﴿وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر)

کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (ابراہیم)

اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا تاکہ وہ ان کو بتا سکے۔

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی تعلیم الٰہی کی تشریح و بیان کے لئے مامور ہیں۔

ایک یہودی کے لئے حضرت موسیٰ کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے ایک زردشتی تمام عالم کو ظلمات کہہ کر بھی نورانی رہ سکتا ہے اور وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دینداری کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعویٰ کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کرے آنحضرت ﷺ تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا ﴿وَالنَّبِيُّونَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ﴾[1] (سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے) غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک اس سے پہلے وہ موسوی، عیسوی، سلیمانی، داؤدی، ابراہیمی نہ ہو لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ (نساء)

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ میں کوئی راستہ نکالیں وہی حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو خدا پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کو الگ نہیں کیا وہ ان کی مزدوری ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔

﴿وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ﴾ (بقرہ)

فرشتوں پر کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔

﴿وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ (نساء)

---

[1] صحیح بخاری باب التہجد

اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

بقرہ کے خاتمہ میں ہے۔

﴿ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ (بقرہ)

ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ﴾ (بقرہ-١٦)

ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اسلام نے اس کی ممانعت کی اور یہ حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لئے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیحؑ کا نام نہ آتا تو بہت سے یہودی مسلمان ہونے کو تیار ہو جاتے لیکن اسلام نے کبھی یہ تفریق گوارا نہیں کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بہت سے یہودی آپ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے مگر حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے آنحضرت ﷺ نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محرومی قبول کی مگر مسیحؑ کی سچائی سے محرومی قبول نہ فرمائی[1] اور ان سے صاف کہا۔

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (مائدہ)

اے یہود! کیا وجہ ہے تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم خدا پر اور جو ہماری طرف اتارا گیا ہے اور جو پہلے اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں تم میں اکثر بے حکم ہیں۔

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے نام سے چڑھتے تھے مگر ان کی خاطر حضرت عیسیٰؑ کی نبوت تقدس اور معصومیت سے انکار نہیں کیا گیا قرآن نے کہا۔

﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴾ (زخرف-٦)

اور جب مریم کے بیٹے کی مثال بیان کی گئی تو تیری قوم اس سے چلا اٹھتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ یہ تم سے جو کہتے ہیں صرف جھگڑنے کو بلکہ وہ جھگڑالو ہیں وہ تو ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ ابن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ہفتم ص ١١٠

بندے تھے اور اپنے عہد کے سب سے بہترین انسان تھے ان کے سب کام خدا کے لئے تھے اور خدا ان کے لئے تھا۔ یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لئے ہر قوم میں پیدا ہوئیں جنہوں نے ان کو مانا انہوں نے نجات پائی اور جنہوں نے جھٹلایا ہلاک و برباد ہوئے' قرآن پاک نے ان کی زندگی کی سوانح' ان کی تبلیغ کی روداد' ان کے اخلاق کی بلندی اور ان کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ ان کی اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور جو تہمتیں ان کی طرف شان نبوت کے خلاف جو باتیں دوسرے صحیفوں میں منسوب تھیں یا ان کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی تردید کر دی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ پیغمبر گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اس لئے انہوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیئے' عیسائی ایک حضرت عیسیٰؑ کو تو معصوم کہتے ہیں باقی سب کی گنہگاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی یکساں سطح قائم کی ہے اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے کہ جو خود گنہگار ہے وہ گنہگاروں کی رہنمائی کا مستحق نہیں کہ اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا' اس بناء پر محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کو دوسری قوموں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگا رکھے تھے ان کو دھو کر پاک و صاف کیا اور یہ رسالت محمدی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کی طرف سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے تو قرآن نے اس کی تردید کی اور خود حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہلوایا۔

﴿ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ﴾ [مریم:۳۲]

اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور مجھ کو خدا نے جبار و بدبخت نہیں بنایا۔

کیونکہ احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز روزہ کی پرواہ نہ کرتے تھے قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا۔

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ﴾ [تحریم:۱۲]

اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔

یہود حضرت سلیمانؑ کو گنڈے' تعویذ اور طلسمات وغیرہ کا موجد کہتے تھے حالانکہ سحر و جادو وغیرہ ذاتاً شرک قرار دیا جاتا تھا قرآن نے اعلانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی۔

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾ [بقرہ:۱۰۲]

اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔

نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کئے' اس لئے گئے یہ ہے کہ جن انبیاءؑ کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیغمبر آئے لیکن بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم ہیں وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہے تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہو سکتا ہے لیکن یقین اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی محمدی ہے اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے۔

اس قسم کے انبیاءؑ جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ آنحضرت ﷺ کے پہلے گذر چکے ہیں اور ان کے پیروان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا یہ درجہ دیتے ہیں' ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے۔

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ (نحل)

اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔

﴿ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ (انبیاء۔۲۵)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں' مجھی کو پوجو۔

اس لئے وہ تمام قدیم رہبران انسانی اور رہنمایان عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے ہوں اور جن کی تبلیغ اور تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور ان کی زندگی اس تعلیم کے شایان شان تھی ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کی بناء پر انبیاء اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں اس بناء پر اسلام کی ان تعلیمات میں سے جن کے تسلیم کئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا ایک یہ ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت ﷺ کے زمانے سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے' ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے البتہ ان انبیاءؑ میں سے ایک کو دوسرے پر بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے۔

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ (بقرہ۔۲۵۳)

ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دی' ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو نشانیاں دیں اور سچائی کی روح سے ہم نے اس کی تائید کی۔

آپ نے دوسرے انبیاءؑ کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو خیر البریہ اے بہترین خلق! کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا وہ تو ابراہیم ؑ تھے۔[1] ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے بزرگ عالی خاندان کون سا تھا' فرمایا یوسفؑ بن پیغمبر بن

---

1 مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۷۸۔

کتب الٰہی پر ایمان

وَکُتُبِہٖ

ایک مسلمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے۔ ہر چند یہ عقیدہ پچھلے عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا اس کی تعلیمات کو وحی کو مان لینے کے مترادف ہے تاہم یہ تصریح اس لئے کی گئی ہے تا کہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (بقرہ۔۱)

اور جو اس (کتاب ہادی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد) اتاری گئی۔

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بہ جان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کے قبول کر لینے کا مختصر ترین طریق تعبیر ہے اس لئے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہے۔ اس لئے قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ ہو سکتا ہے اسی بنا پر اسی کی تشریح آنحضرت ﷺ نے بھی ان الفاظ میں فرمائی کہ "یہ صاحب ہیں جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ"۔ قرآن نے کہا۔

﴿ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﴾ (محمد۔۱)

اور جو ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ صرف یہی و صرف محمد پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحب مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے قرآن نے اپنے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے اور قرار دیا کہ اہل قرآن قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک صحیفۂ محمدی کے ساتھ ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع والی مذکورہ آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (بقرہ۔۱)

اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو تجھ پر اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا۔

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۚ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ ﴾ (بقرہ۔۱)

رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا اور اہل ایمان بھی ہر ایک خدا پر اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی اور باقی تمام انبیاء کا اجمالی ذکر کر کے ان کی کتابوں اور صحیفوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ﴾ (بقرہ-۱۶)

اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے۔

آل عمران میں کسی قدر اور تفصیل ہے۔

﴿ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ﴾ (آل عمران-۹)

کہہ دے کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ اس کے انکار کو کفر قرار دیا گیا۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ ... فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴾ (نساء-۲۰)

اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ خدا پر اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

سورۂ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی بھی تکذیب کریں

﴿ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ﴾ (مومن-۸)

جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا ان کو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی اور وہ کھینچے جائیں گے۔

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے۔ توراۃ جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا گیا ہے اور حضرت داؤد کی زبور اور حضرت عیسیٰ کی انجیل اور خود قرآن ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے۔

﴿ إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ﴾ (اعلیٰ-۱)

یہ باتیں گذشتہ صحیفوں میں بھی ہیں ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں۔

﴿ أَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴾ (طٰہٰ)

کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی؟

﴿ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴾ (شعراء)

اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اسی بناء پر انبیاء کی طرح ان کتابوں پر بھی اسی طرح تفصیل اور اجمالی ایمان ہر مسلمان کا ہے جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں ان پر بالاجمال ایمان ضروری ہے کسی قوم میں اگر کوئی ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحید کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت ہے تو اگرچہ ہم اس کو بتصریح خدا کی کتاب قبول نہیں کر سکتے تاہم بالتصریح اس کو رد بھی نہیں کر سکتے اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب''[1] یہی حال دوسری مذاہب کی کتابوں کا ہے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی دعاوی حیثیتوں کو قبول کرتے ہیں مگر انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحف ابراہیم توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری قوموں کی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کے عظیم الشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا، یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے یہود اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے عیسائی توراۃ اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی بہشت (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے بدھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کریں جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں یہودیوں کی نظر میں دنیا میں صرف دو ہی قومیں ہیں بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانا اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی یہود اور بت پرست

---

1. صحیح بخاری کتاب التوحید حدیث الافک و تفسیر سورۂ بقرہ۔

کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے لیکن حقوق کے حصول کے لئے ان کو یہ موقع نہ ملے گا کہ وہ کسی ملکی آئین ہی کے اندر اپنے کو داخل کریں جیسا کہ ابتدائی عباسیوں کے زمانہ میں حرانی عراقیوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کر کے اپنے حقوق حاصل کر لئے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پابندی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لئے آمادہ کیا اور مجوسیوں اور صابیوں اور یہودیوں عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان

تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم سے لے کر محمد علیہم السلام تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے چنانچہ درحقیقت آپ کی تعلیم یہی تھی اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدم سے محمد علیہم السلام تک برابر پیغمبروں کے ذریعہ آتا رہا اور انسانوں کو اسی کی تعلیم دی جاتی رہی۔

صحیفہ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کئے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعۃ و منسک اور منہاج۔ شرعۃ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں اور منسک کے معنی طریق عبادت کے ہیں۔ دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دین الٰہی ہمیشہ ایک تھا، ایک رہا اور ایک رہے گا۔ نور معرفت ایک ہے تو وہ وقتی وقتی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہوا۔ اصل دین جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاء آتے رہے ہیں اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا اور قوموں کے پیغمبروں نے اسی کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں یعنی خدا کی ہستی اور اس کی توحید، اس کی صفات کاملہ، انبیاء اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی اور اخلاق فاضلہ اور اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا، یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے۔ اگر ان میں سے کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے اور یا باہر سے آ کر اس تعلیم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔

دوسری چیز جس کو آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے شرعۃ منہاج اور منسک کہا ہے وہ جزئیات احکام اور مختلف حصول مقصد کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں۔ مثلاً عبادت الٰہی ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریق عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے۔ عبادت کی کوئی خاص سمت ہر مذہب میں ہے مگر وہ سمت ہر مذہب نے اپنی اپنی مصلحت سے الگ مقرر کی ہے۔ اسی طرح اعمال فاسدہ کا انسداد ہر مذہب کا مقصد نصب العین ہے مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں غرض یہ راستے اور طریقے مختلف

پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاحات اور تبدیلی کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے مگر اصل دین ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے، ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں یکے بعد دیگرے اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی و ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے اور دین کو اپنے اصلی مرکز پر ہمیشہ قائم رکھا اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و وقت اور زمانہ کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لئے مناسب حال ہوں وہ ان کو بتائیں اور سکھائیں۔

انبیاء کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب اس کا صحیفہ اور دین و شریعت کا مجموعہ کھو گیا یا انسانی ہاتھوں کی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اصلیت مشتبہ ہوگئی، صحیفۂ ابراہیم کے گم ہوجانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفر تکوین میں ہے صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا، صحیفۂ موسیٰ کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کے لئے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، پھر اس کی تکمیل کے لئے انجیل آئی، اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لئے آیا اس لئے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی اور قیامت تک کی جائے گی، اس لئے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے البتہ اس کے معانی کی تشریح اور بدعات و اضافات کے انسداد کے لئے آئمہ، خلفاء، مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت محمدی کا احیاء اور بدعات کا قلع قمع ہے۔

اب ہم کو پھر راہ پر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدی کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

"وحدت دین" کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِن بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۝ فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾ (شوریٰ۔ ۱۳-۱۵)

اس نے دین میں تمہارے لئے وہی راہ مقرر کی جو نوح سے کہی تھی اور جو ہم نے تم کو بھیجا اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو وہ بھاری معلوم ہوتا ہے جو ان پر کھلا کرتا ہے، اور خدا اپنی طرف جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اسکو راہ دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے انہوں نے وہی علم حقیقی ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کئے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقت مقررہ تک کے لئے نہ ہو چکی ہوتی تو (کشف حقیقت کر کے) ان کے اختلافات کا

فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس امر حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو بے چین کئے ہوئے ہے تو تم سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استوار رہ جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے، ہم کو ہمارے کام کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کام کا، ہم میں اور تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اللہ ہم سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔

ان آیات مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو اور ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور تم کو اے محمد ﷺ دیا گیا ہے، اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذاتی ترجیحات اور ذاتی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کئے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے الگ الگ فرقہ واری کی راہیں نکالیں پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدت دین کی حقیقت کا یقین اہل کتاب کو نہیں ہے، وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہیں، پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اے اہل کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہو ان کے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں یا معاملات میں ان کے ساتھ عدل و انصاف کروں، پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے دو نہیں، اگر اتحاد ہو تو اس نقطہ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے اس کے ذمہ دار ہم اور تم خود ہیں، ہمارے کام کے تم جواب دہ نہیں اور تمہارے کام کے ہم جواب دہ نہیں، اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے

﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴾ (آل عمران)

اے ایمان والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے متفق ہو جائیں وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم خدا ہی کے تابع (مسلم) ہیں۔

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ واریوں سے اصل دین میں تحریفیں پیدا کر دی تھیں ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا

﴿ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴾ (انعام)

بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے تجھ کو ان سے کوئی کام نہیں ان کا کام اللہ کے حوالے ہے پھر وہی ان کو جتلا دے گا جیسا کچھ وہ کرتے تھے۔

پھر دوسروں کو اس کے بعد ہی اصل "دین قیم" کی جو ابراہیم کا تھا دعوت دی گئی۔

﴿قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (انعام)

کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی جو دین قیم ہے ابراہیم کی ملت اور وہ (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھا۔

غرض اسلام وہ "دین قیم" ہے جو ہمیشہ سے انبیاء کا دین رہا اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات اور تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے جس کی طرف انبیاء اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو پکارتے رہے اسی لئے اکثر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت فرمائی گئی۔

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (انعام)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی تو تو انہی کی راہ پر چل۔

بعض اسلامی حدود و شرائع کے بعد فرمایا گیا۔

﴿يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ﴾ (نساء)

خدا چاہتا ہے کہ تمہارے سامنے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے آگے تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے اور یہ مرادھ ہے جو لوگ قرآن کا اس لئے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی نیا صحیفہ ہے ان سے یہ کہا گیا۔

﴿إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۔ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ﴾ (اعلیٰ)

بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں بھی تھی یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ایک اور آیت میں کہا گیا:

﴿وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ﴾ (شعراء)

اور یہ پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا۔

﴿مَّا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ﴾ (حم سجدہ)

(اے محمد) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا

ان اعلانات میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا بلکہ اسی پرانی دعوت کی یہ تکرار ہے جس کی آواز دنیا سے کم ہو چکی تھی یا دب گئی تھی اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گذشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لئے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ دنیا کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا اور ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف

وتحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمال بلوغ کے زمانے میں وہ پوری طاقت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور وہ قیامت تک محفوظ اور باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے اور جو اصل مقصد نہیں ذریعہ ہے وہ بدلتی رہتی ہے اور عہد محمدی تک بدلتی رہی ہے اس کا نام شرعہ منہاج اور منسک ہے یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ وہ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں' قرآن نے اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ یہ مقصود نہیں، ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے' حضرت داؤد کی اولاد بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی، وہ ان کا قبلہ ہوئی' ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی دلبستگی اور لگاؤ تھا' اس لئے یہ ان کا قبلہ بنی چنانچہ قرآن نے تعیین قبلہ کے موقع پر کہا۔

﴿ وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ (بقرہ)

اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو، بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو۔ اسی لئے فرمایا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ ﴾ (بقرہ)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رخ کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)

اسی طرح خانہ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا' اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر مذہب نے اپنے لئے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے' اسلام نے خانہ کعبہ کے حج کو اس کے لئے متعین کیا۔

﴿ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ ۝ وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴾ (حج۔۶۶۔۶۷)

ہر قوم کے لئے ہم نے عبادت کا ایک طریقہ بنایا کہ اس قوم کے لوگ اس طرح بندگی ادا کرتے ہیں سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں' تو اپنے رب کی طرف بلائے جا' تو بے شک سیدھی سیدھی راہ پر ہے اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا' ہے جو تم کرتے ہو۔

سورہ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں کو جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں' جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔

پہلے یہودیوں کو کہا۔

﴿ إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ﴾ (مائدہ)

ہم نے تورات اتاری اس میں ہدایت اور روشنی تھی' پیغمبر جو حکم بردار تھے وہ یہود کا فیصلہ کرتے اور ان کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے اور وہ تھے اس پر خبردار۔

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے۔

﴿ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ﴾ (بقرہ)

اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ۔

﴿ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ. فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ﴾ (بقرہ)

کہہ بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو موحد تھا مشرک نہ تھا اور کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا سب پر ایمان لائے ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔

یہود و نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

﴿ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ﴾ (بقرہ)

یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

جواب دیا گیا۔

﴿ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ﴾ (بقرہ)

یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔

بلکہ ﴿ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ (بقرہ۔۱۱۲)

ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہو گا اور نہ غم۔

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ (بقرہ۔ ۶۲)

بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئی جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دور

نبوت میں خدا کی توحید پر روز آخرت کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کئے ان کو اپنے کام کا پورا پورا ثواب ملے گا، یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر و بت پرستی سے یقیناً پاک تھی عمل کیا اس کو اس کا ثواب ملے گا۔ خدا کی توحید اور روز آخرت کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہو سکتا بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے جیسا کہ تمام اہل مذاہب کا متفقہ مسئلہ ہے اس لئے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴾ (نساء)

بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اس کے درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے اہانت کرنے والا عذاب تیار کیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوری یہاں خدا دے گا اور خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

دوسری آیت میں ہے۔

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ﴾ (نور)

مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ قبول عمل کے لئے ایمان شرط ہے اور دوسرے یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لئے نبی کی تصدیق ضروری ہے اس لئے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا ہے وہ چاروں وہی ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کو مانتے والے ہیں اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے۔

﴿ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ (مائدہ-۶۸-۶۹)

کہہ دے اے کتاب والو! تم کسی راہ پر نہیں جب تک تم تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا اس کو قائم نہ کرو اور اے پیغمبر! جو تیری طرف اترا ہے وہ ان کی سرکشی اور ناشکری اور بڑھا دے گا تو منکر لوگوں کا غم نہ کر، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا، اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیت مسیح میں مبتلا ہو گئے اس لئے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے فرمایا:

﴿لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۔ وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (المائدہ: ۷۰-۷۳)

بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے، جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لے کر آیا تو کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے پھر خدا ان پر متوجہ ہوا اور ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہوئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح ہی اللہ ہے، مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہے، بے شک جو اللہ کا شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گنہگاروں کی کوئی مدد کرنے والا نہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں تیسرا ہے، حالانکہ کوئی اللہ نہیں مگر وہی ایک، اگر وہ اپنے اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب پہنچے گا۔

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے ایمان کا حال تھا اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے "حسن عمل" کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے۔

﴿وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ (المائدہ: ۸۱)

اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس پر یہ ایمان لے آتے تو ان مشرکوں کو وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد مشترک دین کا اصل الاصول دو ہی تھیں یعنی توحید کامل اور رسالت عمومی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلا شریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا چنانچہ فرمایا:

﴿أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۔ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ

وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۞ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾ (آل عمران۔ ۸۳ تا ۸۵)

کیا وہ دین الٰہی کے سوا کوئی دین چاہتے ہیں حالانکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے، سب اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے (اے پیغمبر) کہہ کہ ہم خدا پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد پر اترا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا، اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین الٰہی ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے ان اصولوں کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ کی تاویلات باطلہ اور باہمی تفرقہ بندیوں کی وجہ سے گمراہ ہو گئے یعنی دین اسلام سے دور ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے فرمایا

﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۞ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ﴾ (آل عمران۔ ۱۹-۲۰)

بے شبہ دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے تو اگر اے پیغمبر یہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیرووں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ بھی اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

﴿وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴾ (آل عمران۔ ۲۰)

اور اے پیغمبر ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا؟ اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پالی، اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت عامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام "ہدایت عامہ" ہے کہ وہ دین اسلام جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گذشتہ پیغمبر کی امت ہیں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے اس لئے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آپ آئے وہ کامل ہے نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود "توحید کامل" ہے اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابی وغیرہ اپنے موجودہ مذہب

عقیدوں کے ساتھ نجات کلی کے مستحق ہیں یہود و نصاریٰ کیا مسلمان بھی ان عقیدوں کے بغیر نجات کلی کے مستحق نہیں جب تک ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہوں جو ان کے رسول کے ذریعہ دنیا میں آئی ہے یہ اصول ہر ایک کے لئے ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی ہو یا عیسائی ہو یا صابی ہو غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

نبوت محمدی کا دعویٰ یہ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے، بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں سب ناقص ہیں یعنی وہ پوری کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے اور ان کے پیرو اپنے غلط یادداشت، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اسی کو لے کر آخری دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی پھر کبھی ناقص نہ ہوگی کہ اس کا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلاف و تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدی کی دعوت جہاں دی گئی ہے، ہدایت کی بشارت سنائی گئی ہے چنانچہ اسی آیت میں جو ابھی اوپر گذری ہے۔

﴿وَقُلْ لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيّٖنَ ءَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (آل عمران۔ ۲۰)

اور اے پیغمبر ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے اگر اسلام لائے تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلٰى إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۞ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾ (بقرہ۔ ۱۳۷،۱۳۶)

(اے مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہم پر اترا اور جو ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد پر اترا اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا سب پر ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی میں بھی کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر وہ اس سے پھرتے ہیں تو وہ مخالفت میں ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کو تعلیم محمدی کی طرف دعوت اسی "ہدایت" کے پانے کے لئے ہے جو اسلام یعنی انبیاء کے دین ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور فلاح و نجات کامل اب اسی کے ماننے میں منحصر ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۞ أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (بقرہ۔ ۵،۴)

جو اس کو جو تیری طرف (اے پیغمبر!) اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

حضرت موسیٰ کے قصہ کے بعد قرآن پاک کہتا ہے کہ رحمت الٰہی گو عام ہے مگر یہ رحمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیم محمدی کو قبول کریں اور وہی نجات کامل کے مستحق ہیں۔

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ (اعراف۔ ۱۵۶۔۱۵۸)

اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے پھر اس رحمت کو میں ان کے لئے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے نشانوں کو مانتے ہیں، جو اس نبی امی فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں، جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اچھی چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے بوجھ کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنھوں نے اس پیغمبر کو مانا، اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتری وہی کامیاب ہیں۔ کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے، سو خدا اور اس کے ان پڑھ پیغامبر رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کرو تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

ان آیات میں صاف ظاہر کردیا گیا کہ گذشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس دین خالص کو جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہوگیا تھا وہ صحف الٰہی کی تحسین و تبیین کے مطابق آپ کے ذریعہ پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیات احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کردیا تھا وہ آپ کے ذریعہ دور کی گئیں، اور چونکہ آپ عالمگیر پیغمبر بن کر مبعوث ہوئے، اس لئے ہدایت عامہ نبوت محمدی اور نجات کامل اور فلاح عام اب وحی محمدی کے اندر محدود ہے۔

الغرض دین محمدی کو قبول کرنا اس لئے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہوگیا تھا اسی کو صحیفہ محمدی لے کر آیا اور اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحف الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے تکمیل دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ

باقی رکھنا اور ختم نبوت حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں۔

تکمیل دین:

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ دین الٰہی اپنے تمام اصول اور فروع (مناسک و مناہج و شرائع) کی حیثیت سے تکمیل کو پہنچ گیا۔ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی۔ خدا نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔

”میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا“ (استثناء ۱۸۔۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا اس سے ثابت ہوا کہ موسیٰؑ کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی کہا۔

”لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا“ (یوحنا ۱۴۔۲۶)

”اور وہ فارقلیط (احمد) آ کر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصور وار ٹھہرائے گا“ گناہ اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی سو کہے گی میری بزرگی کرے گی۔ (یوحنا ۱۶۔۸)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کلام کو ادھورا اور نا تمام ہی فرمایا اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔

آخر وہ موعود الاسلام ﷺ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے آیا ہوں اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں، جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لئے آیا ہوں میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر منصب نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان عام کیا۔

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [مائدہ ۔ ۳]

آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کا دین پسند کیا۔

اس تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض وقتی قومی احکام جو ان کی سخت گیری کے لئے ان پر عائد تھے یا جو اصلی دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام

۔ ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ﴾ (آل عمران ۹۳)

نازل کئے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے تھے اسی لیے قرآن نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی، نہ کسی کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر بنایا کہ جس کے بعد اب کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع نہیں، تمام دینی عقائد میں قرآن نے صرف ﴿وما انزل من قبلک﴾ (جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی، لیکن ﴿وما انزل من بعدک﴾ کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک بھی نہیں۔

قرآن مہیمن کتب ہے:

اسی دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (بقرہ - ۱۱)

اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ (مائدہ)

اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔

مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے۔

ابن عباسؓ: شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہ: قرآن سے پہلے جو کتابیں بھی تھیں قرآن ان کا امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا:

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے تمام تر بری نہیں رہی، لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے قالب میں بدلتا رہا ہے، تورات بخت نصر کے حملہ میں جل کر غائب ہوئی اور پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر ہوئی، پھر ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف و تبدیل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کج فہمیوں نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی، زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا، اور اب صرف اس کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے، ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری مذہب بنا کر نہیں بھیجا تھا اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہ تھا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا، اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (حجر)

ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

یہ وعدہ الٰہی ایک اور دوسری آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے

﴿ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ. فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ. ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴾ (قیامہ)

بے شک ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کو سینے کر رکھنا اور اس کا پڑھنا پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔

اس آیت میں قرآن کی قراءت یعنی الفاظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدا نے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے ایک تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پاسکے گی فرمایا

﴿ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ. لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴾ (حم السجدہ ۵۔۴۲۔۴۱)

اور بے شک یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے باطل نہ اس کے سامنے سے نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آسکے گا ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اترا۔

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا ہے یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے، کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے اس لئے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لئے یہ بھی ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور زمانہ کی تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت:

مقدمات بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو لیکن وحی محمدی نے ہر شک کے ازالہ کے لئے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب آپ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں کہ دین کامل اور صحیفہ الٰہی محفوظ ہو چکا اور ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا اور خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں دنیا کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدت ادیان اور دین اسلام:

تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشا کیا ہے یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے مخالفے میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا اسی دین ازلی کو لے

کہ محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقا اور حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا۔ اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اصل دین پر آجائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ وہی دین ازلی ہوگا جس کا نام اسلام ہے اور قومی یا ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی دین میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا۔ اسی لئے فرمایا گیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ﴾ (نساء۔ ۴۷)

اے وہ لوگو جن کو پہلے کتاب دی گئی اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گنہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی ہم ان پر لعنت کریں اس وحی پر ایمان لاؤ جو ہم نے اب اتاری (قرآن) [جو] ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں تصدیق کرتی ہے۔

مشرکین عرب سے زیادہ اہل کتاب ہی کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا اس لئے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہئے۔

﴿وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ (بقرہ۔ ۵)

اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر تو منکروں کی حالت سے نہ ہو لو

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ﴾ (بقرہ۔ ۱۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو کچھ اتارا اس پر ایمان لاؤ تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اس کو مانتے ہیں اور وہ اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہی قرآن حق ہے اور جو ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ ﷺ نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مسلمان کے مسلمان ہونے کے لئے صرف یہی نہیں فرمایا کہ وہ تنہا آپ کی نبوت پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ وہ تمام نبوتوں اور صحیفوں پر ایمان لائے۔ چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہم وطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے۔

سورۂ سبا میں ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (سبا۔ ۴)

اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب پر (یعنی تورات پر)

اسی لئے آنحضرت ﷺ نے تصریح کے ساتھ یہ فرمایا کہ جو میری نبوت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ بن مریمؑ کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا وہ جنت میں جائے گا

(بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسیٰ) الغرض وہ ازلی و ابدی دین صرف ایک ہی تھا اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے یہی وحدت دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾ (مومنون۔۵۳۔۵۰)

اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بے شک تم سب کی امت ایک امت ہے اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی

﴿الأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ﴾ (بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسیٰ)

تمام انبیاء ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

﴿وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (بقرہ۔٢٢) .... ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ (بقرہ۔١)

اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی[1] ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر ایمان کرنا ہے، سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں جماعت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے۔

﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ (بقرہ)

اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

﴿مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (توبہ)

جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾

جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں۔

"آخرۃ" کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے، عربی میں اصناف کو موصوف کا قائم مقام کرکے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً "دنیا" کے لفظی معنی "قریب ترین" کے ہیں اور یہ صفت ہے، اس کا موصوف حیاۃ (زندگی) یا الدار (گھر) ہے، اس لیے الدنیا کا مفہوم الحیاۃ الدنیا قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی یا الدار الدنیا (قریب ترین گھر) یعنی موجودہ عالم ہے، اسی طرح الآخرۃ (آخرہ) کا مفہوم (الیوم الآخر، الحیوۃ الآخرۃ، الدار الآخرۃ) (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر، اور قرآن پاک میں یہ لفظ انہی معنوں میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حیاۃ (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی۔

﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (عنکبوت)

بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔

﴿وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ﴾ (انعام)

اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔

ان دونوں آیتوں میں (دار) یعنی گھر کا لفظ موجود ہے۔

﴿أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ﴾ (توبہ)

کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہوگئے۔

﴿الَّذِيْنَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (مومنون۔٣)

جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی زندگی کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔

---

[1] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں ایمانیات کی یہ قسم سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

ان آیتوں میں "العاجلۃ" (دنیا) یعنی موجودہ دنیا کے مقابل سے ظاہر ہے کہ "الآخرۃ" سے مراد الحیاۃ الآخرۃ یعنی پچھلی زندگی ہے[1] اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لے کر حشر و نشر اور اس کے بعد تک پیش آتے ہیں یا آئیں گے چنانچہ احادیث سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (ابراہیم)

جو ایمان لائے ان کو اللہ دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات (کلمۂ توحید) پر مضبوط رکھے گا۔

اس آیت میں "آخرت" سے مراد "عالم برزخ" ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قول ثابت پر قائم رہنا کوئی بڑی بات نہ ہوگی جبکہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہوگی۔ اس لئے اس آیت میں "آخرۃ" سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ایک اور حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ "قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے"[2]

یوم آخر اور حیات آخرۃ پر ایمان اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی عقیدہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے تصور کی بنیاد پر قائم ہے اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ یکسر دین سے اکھڑ جائے۔ اسی لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو قطعاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت و فنا نہیں پہلے دور کا نام "برزخ" اور دوسرے کا نام "بعث" یا حشر و نشر اور قیامت ہے اور ان سب کے معنی جی اٹھنے اٹھائے جانے اور اکٹھے ہونے کے ہیں۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس عالم کا نام قرآن میں ﴿الدار الآخرۃ اور عقبی الدار﴾ وغیرہ ہے جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

---

[1] دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کے بیسیوں آیتوں میں مذکور ہے حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (آل عمران۔۵) وہ دنیا اور آخرت میں معزز اور صاحب وجاہت ہے۔
رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ) پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھلائی دے۔
کفار کے حبط اعمال کے ذکر میں ہے حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (بقرہ) ان کے عمل دنیا اور آخرت میں اکارت گئے۔
اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ (نحل) انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔
نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (حم السجدہ) ہم تمہارے دوست ہیں اس زندگی میں اور پچھلی زندگی میں بھی۔
اور کبھی دنیا کے مقابلہ میں "اولیٰ" (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے فرمایا۔
فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ (نازعات۔۲۵) تو خدا نے اس کو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا دی۔
وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ (لیل۔۱۳) اور ہمارے ہی لئے پچھلی اور پہلی زندگی

[2] ابن ماجہ جامع ترمذی کنز العمال [illegible]۔

برزخ

"برزخ" کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ، حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمان میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتا۔

﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ﴾

ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ نہیں جاتا۔

اسی عجیب و غریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا﴾ (فرقان)

اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا، یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی روک بنائی ہے۔

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام "برزخ" ہے۔ سورۂ مومنون میں برزخ کے وقت کے بیان میں ہے کہ

﴿وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ (مومنون-۶)

اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

عربوں بلکہ تمام سامی قوموں کے رسم و رواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام "قبر" ہے خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعر دریا میں یا کسی درندہ یا پرندہ کے پیٹ میں اس لئے فرمایا:

﴿وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ﴾ (حج)

بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ "بعث" صرف انہی مردوں کے لئے مخصوص نہیں جو تودہ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لئے ہے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو۔ اسی لئے قبر سے مقصود یہ وہ مقام ہے جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت و حیات کی منزلیں:

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے۔ ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا ہے۔

﴿رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ﴾ (مومن)

ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا، ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ نے سورۂ بقرہ میں فرمائی ہے۔

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾

کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے پھر تم کو اس نے زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو مارے گا پھر تم کو جلائے گا پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے جب وہ مادہ یا عنصری صورت میں تھا پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا یہ اس کی پہلی زندگی ہے پھر موت آئی روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا یہ دوسری موت ہوئی پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا یہ اس کی دوسری زندگی ہوگی جس کے بعد پھر موت نہیں۔ قرآن پاک میں تو رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا۔

﴿ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ ﴾ (زمر)

بیشک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔

﴿ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ﴾ (مومنون)

پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی اس کے سمجھنے کے لئے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے

نیند اور موت کی مشابہت:

اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لئے اپنی عجیب و غریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے جس کو ہم نیند کہتے ہیں۔ روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے ایک ادراک و احساس کا اور دوسرے تدبیر و تصرف کا۔ نیند کا وہ عالم جس میں تھوڑی دیر کے لئے تمام آلات ادراک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گرد و پیش کی مادی دنیا سے بالکل بیگانہ بن جاتے ہیں تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی نشو و نما اور بقا کی تدبیروں اور دل و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے نظام سانس اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے۔ اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے اس لئے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی آخر منقطع ہو جاتا ہے اس لئے جسم کے اجزاء کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جس کی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ اتفاق الہام غیبی کی تعبیر ہے۔ قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَى أَجَلٌ مُسَمًّى ﴾ (انعام)

وہی ہے جو تم کو رات میں مار دیتا ہے اور جانتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلا اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے۔

﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (زمر)

وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں (یعنی نیند والی کو) ایک مدت معین کے لئے چھوڑ دیتا ہے بیشک اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی نے "برزخ" کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا۔

﴿يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا﴾ (یٰسین)

اے ہماری خرابی کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔

غزوۂ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی اگر وہ میدان جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل کر اپنے مقتل میں خود آجاتے اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے۔

﴿قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ﴾ (آل عمران)

کہہ دے کہ اگر تم گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لئے مارا جانا لکھا گیا تھا وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔

اسی لئے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لئے اکثر "بعث" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں [1] جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ﴾ (انعام)

اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔

﴿وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ﴾ (حج)

اور بیشک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں جگائے گا۔

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نیکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ ﴿نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوسِ﴾ دلہن کی نیند سو جاؤ جس کو وہی جگاتا ہے جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا [2]

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے روح کی ایک طویل بیہوشی [3]

---

[1] صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کے لئے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی کہ یا رسول اللہ انفسنا بید اللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا (ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے) اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔

[2] جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر یہ حدیث حسن غریب ہے۔

[3] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں [illegible] لا یفیق منہا الی یوم القیامۃ (باب ذکر احوال الناس فی البرزخ) یعنی بعض پر عذاب قبر کا اثر خواب میں ہے لیکن یہ کہ وہ ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگ نہیں ہے۔

ہند کے مشابہ ہے۔

خواب میں لذت و الم

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں مگر اس کے ادراک و احساس کی حقیقی تمثالی یا اس کی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح منتقل ہو جاتی ہے اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو اسی جسم کو دیکھتا ہے جو آتا جاتا چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا ہے سب کچھ ہے۔ اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد و رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں۔ اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے اور اگر اس میں لذت ملتی ہے تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی و رنج اور لذت و الم اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی شادی و رنج اور لذت و الم میں فرق نہیں ہوتا۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی بیداری والی لذت و تکلیف احساس و ادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اسی طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے عالم اور ذہن کے مختلف مناظر کے حقائق اور اسباب و علل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب و غریب معاملات سامنے آتے ہیں۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات و معلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں اور اپنے نقوش چھوڑ گئے ہوں بیداری اور مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو وہ خواب میں دفعۃً گراں باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظے سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں بلکہ دماغی خزانہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں اس لئے وہ تمام اچھے اور برے اعمال جو انسان نے کر کے ہیں خواہ وہ آج بھول چکا ہو مگر ان کی یاد ذہن کے گوشوں میں چھپی ہے۔ یہ معدوم مطلق نہیں ہوگی۔

خواب کی عجیب و غریب صورت وہ ہے جس کو تمثیل کہتے ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمت کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں اور حضرت یوسف نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستاروں کی صورت میں دیکھا شاہ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اپنے سر پر روٹی ہے اور اس سے پرندے اس میں چونچ مار کر کھاتے ہیں شاہ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا[1] آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے فتح کر رہے ہیں مسیلمہ اور عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا شہدائے احد کو گائے کی صورت میں ملاحظہ فرمایا مدینہ کی وبا ایک پریشان مو عورت کی صورت میں نظر آئی خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمر

۱۔ یہ کل تفصیلی روایات آگے آ رہی ہیں۔

چونکہ وہ دنیا میں (دل کا) اندھا تھا وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا۔

﴿قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من آتاه الله مالا فلم يؤد زكاته مثل له ماله شجاعا اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيامة يأخذ بلهزمتيه اي شدقيه يقول انا مالك انا كنزك﴾

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو خدا نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو گنجے کرنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال میں ہوں تیرا خزانہ

اسی طرح وہ حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال عذاب سے بچنے کے لئے مختلف سمتوں سے نمودار ہوں گے[1]۔ یہ بھی حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتہ کسی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے ﴿مثلت الشمس عند غروبها﴾ نیک مرد مسلمان اس کو اس وقت دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے[2]۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ دنیاوی آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوتی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں:

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لئے ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپ نے اس کی تعبیر میں فرمایا۔

﴿ذلك عمله﴾ (بخاری کتاب التعبیر)

یہ نہر ان کا (نیک) عمل ہے۔

اس تمہید کے بعد آنحضرت ﷺ کے اس رویائے صادقہ پر غور کرو جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کیونکہ ابھی وہ آئی نہیں بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے جو اب بھی قائم ہے آپ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس

---

۱ مسند حنبل۔

۲ سنن ابن ماجہ ذکر القبر ص ۳۲۹۔

نے سر پر ایک بڑا پتھر لئے کھڑا ہے اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح زور سے مارتا ہے کہ اس کا سر کچل کر چور چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھک کر لڑھکتا چلا جاتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص لیٹا ہوا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لئے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو، پھر نتھنے کو، پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں اور وہ چیختے ہیں آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے۔ نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر جمع ہیں وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر قسم کی گل ریزی تھی باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے کبھی دیکھا تھا یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھے تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے دروازہ کھلوایا وہ کھلا تو ہم اس کے اندر گھسے تو وہاں ہم کو کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا نہایت ہی بدصورت تھا میرے ہمراہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو شہر میں نہایت صاف شفاف بہہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنت عدن ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا سپید ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے، اور دوسرا شخص جس کے کلّے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام جہان میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور کی سی گڑھے میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا اور منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خوار ہے اور باغ بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیم تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ تھے جو فطرت پر مرے تھے، کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے اچھے کام بھی کئے تھے تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیئے۔ [۱]

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل

---

۱ صحیح بخاری کتاب التعبیر صفحہ

سے اس کو دیکھ لو گے۔

بتایا کہ اگر انسان اپنے اندر علم یقین حاصل کر لے جو کمال ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ ابھی دیکھ لے۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ﴾ (تکاثر)

نہیں یہ بات یقینی، اگر تم کو علم یقین ہو تو دوزخ کو بے شبہ دیکھ لو گے۔

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے وحی الٰہی نے اس کے جواب میں کہا

﴿يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ﴾ (عنکبوت)

وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں اس کے جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا، وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ﴾

اور ان کا کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالئے ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں اس لئے ان کو اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے اٹھ جائے گا اس وقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے، اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ کے کچھ مناظر ان کے سامنے آ جائیں گے اور اس وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کر لیں گے۔

﴿ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ﴾ (تکاثر)

پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لو گے۔

یہ موت کے بعد کا سماں ہو گا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا۔

﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾ (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آ جائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا، وہ علم حقیقی اور یقین تحقیقی کا دن ہو گا قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے۔

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ، فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ (ق)

اور صور پھونکا گیا یہ ہے ڈر کا دن۔ تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ جائیں گے اور دوزخ منظر عام پر آ جائے گی فرمایا۔

﴿ فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ۞ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ۞ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ﴾ (نازعات-۳۶)

جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آئے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے بارز کی جائے گی۔

احوال برزخ کا عین الیقین:

ایک عرب شاعر (ابو العتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے۔

﴿ الموت باب وكل الناس داخله فليت شعري بعد الباب ما الدار ﴾

موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے۔

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کی آنکھ پر پردہ کا کنارہ تھوڑا بہت ہٹ جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے فرمایا۔

﴿ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۞ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴾ (مومنون-۱۰۰)

جب ان گنہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ دوزخ کے کچھ پردے کے بعض مناظر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھے ایک بار دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو مال چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کروں ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے۔

جو وہ کہتا ہے اور اب ان گنہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آ جاتی تو اس کا شک و شبہ دفعۃً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے فرمایا۔

﴿ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ ﴾ (ق-۱۹)

اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آ گئی یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت "حقیقت" کا کوئی منظر سامنے ضرور آ جاتا ہے اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے ابن جریر طبری لکھتے ہیں۔[1]

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۹۔

گئی ہے۔

﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (جمعہ۔۱)

کہہ دو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملاقی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے۔ تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔

﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (البقرہ)

ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے

﴿اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا﴾ (مائدہ۔۱۴)

تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہ طرز ادا متعدد آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں رفت و آمد داخل ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عنصری چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں اس بازگشت کے سفر میں ان کا زاد راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا سے دار العمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے انہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (انعام۔۷)

اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کر چکے اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تا کہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو تمہارے عمل بتائے گا۔

ایک اور آیت میں ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (یونس۔۳)

اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھا لو پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو تمہارے اعمال بتائیں گے۔

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آجانے کی اطلاع دی ہے اور ابن جریر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی لیے ہیں (طبری جلد ۱۱ صفحہ ۶۰ مصر) اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے پاس ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں ویسے ہی گنہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں فرمایا۔

﴿كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ وَقِیْلَ مَنْ رَاقٍ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ اِلْمَسَاقُ﴾ (قیامہ۔۱)

ہرگز نہیں جب روح ہنسلی (حلق) تک آ پہنچی اور لوگ کہیں کہ اب کون ہے جو تعویذ کرنے والا اور سمجھا کہ جدائی کا وقت آ گیا اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدا سنائی دیتی ہے۔

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ [فجر۔ ۲۷،۲۸]

اے مطمئن روح تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس چل جا۔

یہ کیسی دل آویز صدا اور کیسی دلکش واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں:

وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فرصت ختم ہوتی ہے کتنا دردناک ہے اس وقت سے اس کی زندگی صرف اس کے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے جس کی صورت اس کے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں۔

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ... وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ﴾ (انعام۔ ۹۳،۹۴)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار موت کی بیہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو اپنے جسموں کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو اس بے عزتی کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹی باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے سامنے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا ہمارے پاس آئے اور جو سامان اسباب تم کو دیا تھا جس سے تم کو غرور تھا اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے۔

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ (انفال۔ ۷)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانون عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نیکوکاروں کا قصہ اس سے بالکل الگ ہے۔ ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے۔

﴿ فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ۝ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ۝ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ ۝ فَلَوْلَا إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۝ تَرْجِعُونَهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ۝ وَأَمَّا إِن كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۝ فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۝ وَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ۝ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ﴾ (واقعہ۔ ۸۳)

پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلٹا دیتے ہو اگر تم اپنے انکار عذاب میں سچے ہو تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہوا تو خوشی و آرام اور نعمت کی جنت ہے اور اگر وہ اس سے ہے کہ تم داہنے والوں میں ہو تو تجھ پر سلامتی داہنے والوں میں سے ہوا اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں جھونکنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔

یہ تمام احوال موت کے بعد اور عالم برزخ کے متعلق ہیں۔

برزخ کا عذاب و راحت:

اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے سامنے عذاب کے منظر گزرتے ہیں قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گزرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے منافقین کی نسبت قرآن میں ہے۔

﴿ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ﴾ (توبہ۔ ۱۳)

ہم ان کو دو دفعہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عذاب عظیم سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے جو دو دور ان پر گزر چکے ہوں گے ان میں ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے۔

﴿ وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۝ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۝ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ﴾ (مومن۔ ۵)

اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت کی گھڑی ہوگی (خدا حکم دے گا کہ) فرعون والوں کو پہلے سے بھی بدتر عذاب میں ڈالو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزا چکھایا جاتا ہے ایسے ہی نیکوکاروں کو جنت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت ﷺ نے فرمایا

جن اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی۔ اس لئے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں۔ جسم صرف بمنزلہ آلہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادیات سے پاک و بری ہوگا تاہم اس کو اپنے قدیم جسم سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اسی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں۔ قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے۔

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾ (انفال۔۷)

اور کاش تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں چکھو جلنے کا مزہ۔

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاش کی صورت میں ہوتے ہیں بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو جب ہنکاتے ہیں تو آگے (منہ) پر اور کبھی پیچھے (پیٹھ) پر مارتے ہیں اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہانکتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چکھو عذاب کا مزہ چکھو۔ یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے۔

﴿إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ﴾ (قیامہ۔۱)

اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہنکایا جانا۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں ان کے جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے بھی آزاد کر کے دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے"[1] اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی۔ اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو رویائے صادقہ پہلے گزر چکا ہے اس میں جن بد اعمالیوں میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام تر مثالی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہداء کے وہ مثالی قالب اور ان گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب و اجسام نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں گل سڑ کر فنا ہو گئے یا دوا آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے اور ہوا میں اڑ کر منتشر ہو گئے یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کے جزو بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان لوگوں کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و محاورہ میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اسی مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا۔ ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے تا کہ وہ خدا کے سامنے حاضر

---

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

[2] صحیح بخاری جلد دوم ص ۹۵۹ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ۔

خدا بن جاتے مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کفر آمیز کر دیا اور اس کو خدا تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔

سوال و جواب:

احادیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔

اس کی تصدیق قرآن پاک کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔

﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلے جنت میں چلے جاؤ۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ﴾

بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے وہ ان سے کہتے ہیں تم کس بات میں تھے، وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے، وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔

ایک اور آیت ہے۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ﴾ (اعراف۔۴)

یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کے سوا پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے سے وہ ہم سے کھوئے گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا کر جو جن و انس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہرحال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے یعنی توحید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہوگا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمۂ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمۂ توحید) اور کلمۂ خبیثہ (بری بات یعنی کلمۂ کفر) کی ایک ایک مثال ہے۔ کلمۂ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں اور اس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے اور اب گرا اور تب گرا۔ اس کے بعد قرآن میں ہے۔

﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ﴾ (ابراہیم)

اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی اور ستمگاروں کو بچلاتا ہے۔

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحبِ ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا اسی طرح برزخ میں بھی وہ اس پر قائم رہے گا، اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا وہ وہاں بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔

ہر چند کہ رسول پاک ﷺ سے صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہلِ ایمان کے "آخرت میں بھی" "قولِ ثابت" پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے، اس دن تو کافر بھی اس قولِ ثابت سے ہٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا، پھر یہ اہلِ ایمان کے لئے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی، اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہو سکتا تھا، جہاں ابھی اسرار کے پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی، اور وہ برزخ کا عالم ہے۔

اس آیت پاک کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعتِ مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔

حقیقت میں اس عالمِ برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا، بلکہ ہر روح کی پچھلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثالی ہوگی، یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا، یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن:

آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواحِ انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت ان مذکورہ بالا آیات کے بعد ہے، جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں، اس کے بعد ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (اعراف۔۵)

بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا، ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بلندیوں کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی یا اپنے جسم خاکی کے لگاؤ سے جہاں وہ سپرد خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف جو متقی پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمت الٰہی کا فرشتہ بلکہ خود زبانِ رحمت اس کے کانوں میں صدا دیتی ہے۔

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (فجر ۱)

اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چل جا، تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

ان سے بڑھ کر وہ پاک روحیں ہیں جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خواہشوں اور دل کی پیاری چیزوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو خدا کی طرف سے ایک مثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے فرمایا

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ﴾ (بقرہ-۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔

یہ پر مسرت زندگی کیسی ہوگی اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ، فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ، يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ﴾

(آل عمران-۱۷)

اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں ان کو روزی دی جاتی ہے خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں ان کی طرف سے بھی خوش ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں اور اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

یہ پر مسرت زندگی شہداء کو ملے گی اس زندگی کا مقام "خدا کے پاس" بتایا گیا ہے احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں اس کے بعد غالباً اتنا ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہداء سے بہرحال اعلیٰ اور برتر ہیں اس لئے ان کا مقام بھی اسی حظیرۂ قدس کے اندر ہوگا اسی لئے آنحضرت ﷺ نے سیر معراج اور اپنے رویائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔

بعض وہ سعید روحیں ہوں گی جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جائیں گی جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالم ملکوت میں اڑ رہے تھے عالم برزخ کے یہ دو اڑنے والے بازو درحقیقت ان کے دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو اس جنگ میں

ان کے جسم سے کٹ کٹ کر گرتے تھے اور وہ اس پر بھی اسلام سے قدم کو پیچھے نہ ہٹاتے تھے، وہ عزم و ثبات کے پہاڑ سے بڑھ کر تھے، تعجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ﴾ (حم السجدہ ۴)

بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے، تو ان پر فرشتے یہ خوشخبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سے خوش ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم دنیاوی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی۔

یہ اعزاز و بشارت اور فرشتوں کی رفاقت اسی عزم و ثبات کا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ حضرت مسیح کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے، ایک صدوقی جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا اور قیامت کا منکر تھا، دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا بدستور پرانے عقیدہ پر قائم تھا۔[1] آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی جو یہود تھے وہ قیامت اور حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو دوسری پر زمینوں کو اور تیسری پر درختوں کو چوتھی پر پانی کو اور اندر کی زمین کو اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھ کر اعلان کرے گا کہ "میں ہوں بادشاہ"۔[2] انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور حضرت عیسیٰ نے صدوقیوں کے مقابلہ میں توراۃ کی ایک آیت سے حیات اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے۔[3] اور مکاشفات یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے۔ ہندو پرلے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے تھے لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام:

کسی شے کی حقیقت کی دلیل اور نشانی اس کے ناموں کی تشریح سے ملتی ہے قرآن پاک میں قیامت کو متعدد ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے کسی نہ کسی پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو قرآن کی سب سے پہلی سورہ میں ہے وہ یوم الدین ہے یعنی جزا کا دن جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ اصلی جزا اور سزا یعنی عدالت کا دن ہوگا اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جا بجا آئے ہیں۔

اَلسَّاعَةُ	وہ گھڑی (وہ مقررہ وقت)۔
يَوْمُ الْقِيَامَةِ	کھڑے ہونے کا دن (مردوں کے کھڑے ہونے کا دن)۔
اَلْيَوْمُ الْحَقُّ	سچا دن (جس کے آنے میں ذرا شک نہیں ہے اور جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی نہ ہوگی)۔
يَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ	جانا ہوا دن یا مقررہ دن۔
اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت۔
اَلْيَوْمُ الْمَوْعُوْدُ	موعود دن۔
اَلْيَوْمُ الْاٰخِرُ	پچھلا دن۔
يَوْمُ الْاٰزِفَةِ	قریب آنے والی مصیبت کا دن۔
يَوْمٌ عَسِيْرٌ	ایک سخت دن۔

---

1. زبور [illegible] باب [illegible]۔
2. انجیل مرقس ۱۲، [illegible] و لوقا [illegible]۔
3. صحیح بخاری تفسیر سورۂ زمر۔
4. متی [illegible] و مرقس [illegible]۔

یوم عظیم	بڑا دن۔
یوم عصیب	سخت دن۔
یوم البعث	جی اٹھنے کا دن۔
یوم التلاق	باہم ملنے کا دن۔
یوم التناد	پکار کا دن۔
یوم الجمع	اکٹھے ہونے کا دن۔
یوم الحساب	حساب کا دن۔
یوم الحسرۃ	حسرت کا دن۔
یوم الخروج	قبروں سے نکلنے کا دن۔
یوم الفصل	فیصلہ کا دن۔
القارعۃ	کھڑکھڑانے والی۔
الغاشیۃ	چھا جانے والی۔
الطامۃ الکبریٰ	بڑی مصیبت۔
النبأ العظیم	بڑی خبر۔
الحاقۃ	ضرور آنے والی گھڑی۔
الوعد	وعدہ۔
الواقعۃ	وقوع پذیر۔
امر اللہ	خدا کی بات۔
الصاخۃ	بہرا کرنے والی کڑک۔

قیامت کے اوصاف:

یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی تعبیرات قرآن میں آئے ہیں مثلاً

﴿ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ﴾ (انعام۔ ۹)

جس دن نرسنگھ پھونکا جائے۔

﴿ یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ ﴾ (طارق۔ ۹)

جس دن چھپی باتوں کی جانچ ہوگی۔

﴿ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾ (شعراء۔ ۸۸)

جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد۔

﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ ﴾ (فرقان۔۳)

جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔

﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ ﴾ (فرقان۔۳)

جس دن آسمان پھٹے گا۔

﴿ يَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴾ (مومن۔۶)

اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔

﴿ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ﴾ (آل عمران۔۱)

جس دن میں کوئی شک نہیں۔

﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا ﴾ (نمل۔۶)

جس دن ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔

﴿ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴾ (مطففین۔۱)

جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لئے کھڑے ہوں گے۔

﴿ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ ﴾ (قمر۔۱)

جس دن لوگ قبروں سے نکلیں گے۔

﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۔ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۔ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴾ (عبس۔۱)

جس دن آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔

﴿ يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا ﴾ (بقرہ۔۶)

جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ ﴾ (نور۔۳)

جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔

﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا ﴾ (انفطار۔۱)

جس دن کوئی کسی دوسرے کے لئے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔

﴿ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا ﴾ (دخان۔۲)

جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے اور دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کئے گئے ہیں جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، مجبوری اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فساد نظام ہوگا:

قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے کلی یا عدم محض کا نام ہے حالانکہ یہ بات

﴿ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ ۝ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ۝ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ وَانشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ﴾ (الحاقہ)

جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں کوٹ دیے جائیں گے اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن کمزور ہو جائے گا۔

﴿ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ...... فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝ السَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ﴾ (مزمل)

جب زمین اور پہاڑوں میں زلزلہ ہوگا اور پہاڑ پھسلتا ہوا تودہ ہو جائے گا ...... تم کیونکر بچو گے اگر تم نے اس دن کا انکار کیا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا آسمان اس دن پھٹ جائے گا خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ ﴾ (ابراہیم)

جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔

﴿ فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴾ (الرحمٰن)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ چمڑے کی طرح ہو جائیں گے۔

﴿ إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ۝ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنبَثًّا ﴾ (واقعہ)

جب ہونے والی بات ہو جائے گی جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں، پست کرنے والی بلند کرنے والی، جب زمین سب ہلا دی جائے گی اور پہاڑ پراگندہ کئے جائیں گے اس وقت وہ پریشان ذرے کی طرح ہو جائیں گے۔

﴿ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴾ (نبا)

اور آسمان کھول دیے جائیں گے اور دروازے دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو جائیں گے۔

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظام عالم کی درہمی اور دنیا کی حیات موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے اعمال کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا۔

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ ۖ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ (ابراہیم)

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔

قیامت کی حقیقت:

اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گوناگوں طریقوں سے آیا ہے تاہم ایک خاص سورۃ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے جس میں نہایت اختصار و اعجاز کے باوجود حقیقی بیانات

اصول پر تمام اقوام عالم کا مجموعہ بھی پیدا ہوتا، بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، وہ ایک دن فنا کے گھاٹ کے آغوش میں جا کر سو جائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آل فرعون وغیرہ کی تباہی سے قیامت کی معنوی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفس لوامہ یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا ہے اور اس کو گنہگار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے قصور وار جانتا ہے اور گنہگار ٹھہراتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور اپنی کوتاہیوں سے شرمندہ ہوتا ہے اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی اور اس کا ضمیر و نفس لوامہ اس کو ملامت کرے گا کہ کائنات انسانی سے جو مقصود تھا کائنات ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی، اسی معنوی اعتراف قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے اس سورہ یا نام میں نفس لوامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم میں یکجا شہادت میں یکجا کیا گیا ہے اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھئے۔[1]

(۲) اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے اس میں سردی گرمی، بیماری و تندرستی، بقا و فنا اور غرض ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے وہ زندہ رہتی ہیں اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہیں، ایک درخت میں ایک پھول کھلا، سردی، گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا جب تک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی وہ پھول شگفتہ رہا جس آن میں کسی قوت نے شکست کھائی پھول کی ہستی معرض فنا میں آگئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد، خاندان، جماعتیں، قومیں بلکہ حیوانات، شجر و حجر، غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

پوری کائنات ہستی کو لیجئے اس کو خلاق عالم نے انہیں متضاد عناصر و اخلاط کے اصول پر ترتیب دیا ہے، دن رات، روشنی تاریکی، سردی اور گرمی، پانی اور آگ، بہار و خزاں، تندرستی اور بیماری، دولت اور افلاس، حیات و موت، آسمان و زمین، نیکی و بدی، خیر و شر، غرض جدھر بھی دیکھئے معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری انہیں متضاد قویٰ اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے، ان میں جب تک اعتدال قائم ہے یہ دنیا کی ہستی چل رہی ہے، جس دن ان کے اعتدال میں فرق آئے گا وہی دن اس کی فنا کا ہوگا۔

لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں جہاں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں موجود ہیں، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہوگئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتاً وہ پھر ابھری اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتی نوح بن کر زمین کو بچا لے گیا، اس باغ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا، اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی

[1] مستفاد از تفسیر سورۂ قیامت مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ

پکر سے اپنی رفتار میں ہم موافقت کرنے کے قریب پہنچ کر پھر سمٹ گئے گر فساد وصلاح کا یہ اصول اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قوتوں اور کائنات کے استعدادات میں یہ اعتدال قائم ہے، جس دن یہ اعتدال فنا ہوگا نظام ارضی کا یہ پورا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ سچے خالق کے سامنے حاضر ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی وقصور کی شہادت اپنی زبان سے ادا کرے گی۔

﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا. وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا. وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا. يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا. بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا. يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ. فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ. وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ (زلزال۔۱)

جس وقت پوری زمین ہلا دی جائے گی اور جب زمین اپنے اندر کے بوجھ کو نکال دے گی، اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے، اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے حکم دیا ہے، اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے تاکہ اپنے عمل دیکھیں، تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو اس کو بھی دیکھ لے گا۔

صور قیامت:

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر آیا ہے ﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ﴾ "پھر جب صور پھونکا جائے گا" صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں، اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کلدانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال وجلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، اس لئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کے اظہار اور غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ تورات میں یہ کنایہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی ﴿لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ "آج کس کی بادشاہی ہے" پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا ﴿لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ "اس ایک سب پر غالب آنے والے کی" غرض وہ دن آسمان وزمین اور عالم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرہ جنگ کے اعلان کا ہوگا، اس لئے اس کے لئے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خداتعالیٰ لفظی معنوں میں بھی اس دن اپنی شہنشاہی کے نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو۔

عربوں کا انکار:

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہل عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا اور جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے، جاہلی عرب حیات بعد الموت اور خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرسش اور جزا وسزا سے قطعاً لاعلم تھے اور اس لئے ان میں اعمال کے خیر وشر اور نیکی بدی کی وہ تمیز نہ تھی جس پر تمام اخلاق ومعاملات کا دارومدار ہے۔ عرب کا شاعر آنحضرتؐ کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے ﴿أَمَوْتٌ ثُمَّ بَعْثٌ ثُمَّ حَشْرٌ حَدِيثُ خُرَافَةٍ يَا أُمَّ عَمْرٍو﴾ کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے پھر اکٹھا ہونا ہے اے ام عمرو! (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں۔ قریش کے ایک دوسرے شاعر کا کہنا ہے ﴿يُخَبِّرُنَا النَّبِيُّ بِأَنْ سَنَحْيَى وَكَيْفَ

۱ صحیح بخاری جلد اول باب الفجر ص ۵۵۵۔

حیاۃ اصداء وھام ﴾ یعنی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کئے جائیں گے حالانکہ صدا اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟

ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے اور اڑتا پھرتا ہے اسی کا نام ان کے ہاں صدیٰ اور ہامہ تھا۔

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کئے گئے ہیں مثلاً

﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ ﴾ (ق۔ ۱)

کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے، یہ لوٹنا بعید ہے۔

﴿ ءَاِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴾ (النازعات۔ ۱)

کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈیاں ہو جائیں گے۔

﴿ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ﴾ (اسرائیل۔ ۵)

کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم نئے بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔

﴿ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴾ (یٰس۔ ۵)

ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا۔

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔

﴿ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (جاثیہ۔ ۳)

انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے دوسری نہیں، مرتے اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مار دیتا ہے۔

﴿ وَقَالُوا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴾ (انعام۔ ۳)

اور انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

انہیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا۔

﴿ إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ﴾ (نبا۔ ۲)

وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔

خباب بن الارتؓ ابتدائی مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے، وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا "جب تک تم محمد کا انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا" انہوں نے کہا کہ "یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جی نہ اٹھو"۔ اس نے کہا "کیا مر کر مجھے پھر جینا ہے؟" انہوں نے کہا "بے شک" اس نے مذاق سے کہا "اچھا تو پھر وہیں میرا مال و دولت اور سر و سامان ہوگا وہیں تم دام بھی لے لینا"۔[1] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں ان کا کفر کتنا شدید تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور موثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ مکرر بیان کیا گیا ہے ان میں موت کی، ہنگامہ قیامت اور حشر و نشر کے دہشت خیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سراپا اثر ہو جائے، تو ان کے بعد جنت کے قصور

۱۔ صحیح بخاری تفسیر کہیعص صفحہ ۶۹۱۔

خدا کی عظمت و قدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع پر قدم قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے
جو ایک طرف حیات ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی
وحشت اور عذاب الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحی الٰہی نے قیامت اور جنت و دوزخ کے حالات و مناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان
سے اہل نظر بھی ناواقف نہ تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں پہلے ایک بڑی سورۃ نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا
بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم
اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے، پھر آیت ﴿بل الساعة موعدهم والساعة أدهى وأمر﴾ (بلکہ
ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی) جب مکہ معظمہ میں اتری اور میں
اس وقت کمسن بچی تھی کھیلتی تھی، بقرہ اور نساء کی سورتیں جن میں احکام ہیں اس وقت اتریں جب میں آنحضرت ﷺ کے
ساتھ رہنے لگی تھی۔[1]

اس تصریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مخبر صادق نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے
کہ اگر یہ تعلیم عقائد میں شامل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل
میں وہ شان اور میلان پیدا ہوتا اور یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا و سزا کا ذکر باقی ہے
دوسرے اہل ایمان کے دل بھی خشیت اور تاثر سے خالی ہو جاتے، چنانچہ اس نقطہ کو خود قرآن نے بیان کیا ہے۔

﴿فالذين لا يؤمنون بالآخرة قلوبهم منكرة وهم مستكبرون﴾ (نحل-۳)
تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں پڑے ہیں۔

اسی لئے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے ﴿مالك يوم الدين﴾ "روز جزا
کا مالک" اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیرووں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل:

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے
ایک یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہوتی تو خیر و شر اور نیکی و
بدی میں قطعی امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جاتے۔

﴿أفحسبتم أنما خلقناكم عبثا وأنكم إلينا لا ترجعون﴾ (مومنون-۶)
اے لوگو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔

﴿أيحسب الإنسان أن يترك سدى﴾ (قیامہ-۲)
کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری بات جو روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۴۶ باب تالیف القرآن۔

ہے اگر اچھے برے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے گا اور نیکی و بدی اور عذاب و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں گے حالانکہ خود بحیثیت خدا کا عالم و حکیم و منصف قرار پاتا ہے اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے مگر ہم کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیک کار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں اس لئے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے اس موجودہ دنیا میں دنیوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے۔ سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔

﴿ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ﴾ (التین-۱)

لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے سے روکتی ہے کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)

اسی لئے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہو سکتا ایک جگہ فرماتا ہے۔

﴿ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ﴾ (ص-۳)

کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان کی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

﴿ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴾ (جاثیہ-۲)

کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمایا یہ خیال کیا کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔

لوگوں کو روز جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جی نہیں اٹھتا تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا ہے اس لئے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کے ناممکن اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے وحی محمدی نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے اس استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا۔

۱۔ مر کر جینے کی بعض تاریخی مثالیں پیش کیں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت عزیرؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں، اور ان سے مقصد یہ ہے کہ جب چند آدمی یا جانور مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے

۲۔ جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے اور پھر دفعتہ بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے سبزے نکل آتے ہیں، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی ﴿وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا﴾ (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی اور دوبارہ ان میں زندگی پیدا کر دے گی)

۳۔ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لئے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آتی جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزے اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا کیا وہ ان کی فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

۴۔ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست ومعدوم تھا خدا نے اس کو ہست وموجود کیا پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی مثال کے اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا۔ جس نے نقش اول بنایا کیا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

۵۔ دنیا میں بڑی بڑی بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے حسب ترقی زور، طاقت، مال، وسعت، جمال اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت وسلطنت قائم کی، پھر جب انہوں نے غرور ونخوت، ظلم وستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی خلاف ورزی کی، حق اور صداقت کی دعوت کے لئے ضروری تھی مخالفت کی تو دفعتہ گرا دی گئیں اور ان کا نام ونشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ عربوں سے سوال کیا گیا کہ تمہارے عاد وثمود جو کبھی خوش حال تھے کہ ملک عراق وشام ومصر وعرب پر چھائے ہوئے تھے کیا ہوئے؟ سبا وتبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہو گئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قوم لوط اور قوم مدین کا زمین پر کیونکر نشان مٹ گیا؟ قرآن نے اہل عرب سے خطاب کر کے کہا:

﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ﴾ (مومن۔۲۱)

کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔

﴿أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۛ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ﴾ (ابراہیم۔۲)

کیا تم تک قوم نوح اور عاد وثمود کی اور جو ان کے بعد آئے جن کو خدا ہی جانتا ہے ان کی خبر تم کو معلوم نہ ہوئی۔

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں اگلی قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں محفوظ ہیں بابلی، اسیریا، کلدانی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لمن الملک بجاتی تھیں آج زمانہ سے

حشر جسمانی :

اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی آیا اسی گوشت پوست کے ساتھ ہوگی یا صرف روحانی ہوگی جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گذر نہ ہوگا گو قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آ جاتی ہیں تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جئے گا کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائے گی بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل ان کے لئے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی ان کے فہم سے دور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے چاہنے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں اس لئے مصلحت الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے اور کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے اور صاحب فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہئے۔

﴿ وَقَالُوٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۢ بَلْ هُمْ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۱)

اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں) بلکہ یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اس لئے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا۔

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۱)

جواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو موت دے گا پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ اس عقیدۂ حشر کی اصلی روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال ہم وہ بے نیاز ہو جائیں تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے متعلق جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ و شنیدہ عالم وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ و شنیدہ ستان بقا کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے کیا ہے۔

جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو گفتگو ہی نہیں، لیکن اگر کوئی شخص جسمانی حشر کا تصور اس لئے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا تو اس کے نزدیک تو دوبارہ روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہونا چاہئے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا ہے بلکہ وہ اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا ہے وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم و شکل و صورت کے ساتھ ہی کرے گا اس سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے اس لئے اگر یہ صحیح ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی تو ظاہر ہے کہ موت کے بعد کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت و کیفیت ہوگی جس کا نام حیات ثانیہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم سے تسلیم کیا جائے ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا ہوگی جس کا نام حیات ثانیہ رکھا دیا گیا۔

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر ہر فاعل کے فاعل بننے کے لئے آلات و اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجا لانے سے مجبور رہتا ہے اسی طرح روح اپنے فعل لذت و الم کے انجام دینے کے لئے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت و الم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا اسی بنا پر روح محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متألم ہونا کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی جسمانی پیکر اور شکل کی صورت متصور ہوتی ہے۔

جسم و جسد:

حشر جسمانی کے ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائے گی یا یہ کہ نیا جسم اپنی ہیئت اور ترکیب میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے نہ جسم پر جیسا ہو، اسی طرح جزا و سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے نہ جسم تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو روح پر مواخذہ اور ثواب و عذاب کی لذت و الم کا احساس یکساں ہوگا البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا اس کی خصوصیات و لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہوں گے چنانچہ ہمارے تخیل اور تصور اور خواب و رؤیا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے بہت بالاتر ہوتا ہے اس لئے فقط جسم کے بول لینے سے اس کی خصوصیات کا جسم بھی لینا ضروری نہیں ہے اور مادی جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اعتراضات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

خلق جدید:

چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا مصنوع ہوگا اسی لئے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ:

﴿ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴾ (ق-۱)

بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں۔

منکرین کی زبان سے کہلوایا

﴿ ءَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ﴾ (اسراء-۵)

کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کرکے اٹھائے جائیں گے۔

ایک دوسری سورۃ میں یہ تحقیق ہے کہ

﴿ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴾ (سبا-۱)

بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔

پھر تمثیل دے کر فرمایا۔

﴿ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ ﴾ (انبیاء-۷)

جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ لوٹائیں گے۔

اسی لئے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ جسم سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ ہماری زبان میں روح کے خلاف و مقابل کے لئے جسم سے بہتر قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہ گذشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لئے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہو تصریح قرآنی پر اضافہ ہے قرآن مجید کی یہ تصریح ہے کہ:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴾ (نساء-۸)

بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے جب ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کو اور کھالیں دیں گے جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی تاکہ وہ عذاب چکھیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو وہ پہلا اصلی حصہ جسم جو گناہ میں شریک تھا کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال کی شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ اصل مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقصد کا فاعل ہے ان جسمانی اعضاء کے علاوہ ہے اور وہ روح انسانی ہے۔

قصوروار روح ہے:

یہی سبب ہے کہ موت حیات، عذاب و ثواب اعمال کے مؤاخذہ کا اصل مرجع جس سے تعلق ہے وہ نفس یعنی روح ہے

﴿ أَن تَقُولَ نَفْسٌ يَا حَسْرَتَىٰ عَلَىٰ مَا فَرَّطتُ فِي جَنبِ اللَّهِ ﴾ (زمر-۶)

تو (قیامت میں) کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔

﴿ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴾ (حشر-۳)

اور چاہئے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لئے کیا آگے بھیجا۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ﴾ (تکویر-۱)

(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ﴾ (انفطار-۱)

اس دن ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔

﴿فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾ (انبیاء-۴)

تو اس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

جنت کی نسبت ہے۔

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ (سجدہ-۲)

کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا اور اسی کو تکلیف و لذت سے آشنا کیا گیا ہے جنت میں داخلہ کی خوشخبری بھی اسی کو دی گئی ہے۔

﴿فَادْخُلِي فِي عِبَادِي، وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (فجر-۱)

اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے:

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی ذمہ دار اور جنت و دوزخ کی لذت و الم کی اصلی احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس و آلۂ احساس کی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں جسم لاکھ بار بدلے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے۔

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ نہ چھپا ہو تو اس مشت خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو کہ انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن زیر و زبر ہو کر بدلتا رہتا ہے اور جاڑوں میں وہ موٹا ہو کر تازہ ہو گیا پھر تدریج کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر پہنائے، تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اس کے ذرے کیونکر ہر آن میں بکھرتے اور گھٹتے رہے اور جو غذا کہ وہ کھاتا ہے وہ خون ہو کر کیونکر بدل کر تحلیل شدہ ذروں کی جگہ لیتی رہی پھر کیا یہ ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب ناز کیا گیا تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگا تھا اس عرصہ میں قطعاً بدل گئے ہیں اس لئے وہ لائق تعزیر نہیں کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا وہ جس طرح کل

تھی بعینہ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے جسم کے ذریعے کل پہنچ سکتی تھی آج بھی بعینہ وہی اس کو پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا اس لئے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضاء کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا جسم کے اجزاء دنیا میں بدلتے جاتے ہیں مگر جو بیاری اگلے اجزاء میں پیدا ہوگئی تھی وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے مٹ نہیں جاتی' بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزاء میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا:

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے عکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی و سپیدی کی صورت میں بدل جائے گا خدا نے فرمایا:

﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴾ (عبس۔۱)

کتنے چہرے اس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔

﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ (آل عمران۔۱۱)

جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے اور کتنے کالے' لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اسی میں سدا رہیں گے۔

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا' ان کا قد حضرت آدمؑ کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا' دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا' کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے دل کے اندھے آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے' سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے' تو پھر ان کے جسم صحیح و سالم نمودار ہوں گے' پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی' یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے' ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

جزا اور سزا

"یوم آخر" یا "یوم دین" پر ایمان لانے سے اسلام کا اصلی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے جو اس دنیا میں اور پھر اس دوسری دنیا میں۔ اسی کا نام جزا اور سزا ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہم نوا ہیں۔

جزا و سزا اور دیگر مذاہب میں:

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے اس کے مطابق اس کا اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا۔ اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی پرانی قوموں میں بھی ملتا ہے۔ ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں آتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس نے گناہ زیادہ کئے ہیں اس کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے جہاں نرک (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتی ہے بعد ازاں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے۔ جس روح نے کچھ کام اب بھی باقی رہا وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے زمین میں دوبارہ آتی ہے اور اپنے کاموں کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے، اور پھر بھٹک کر انسان بنتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل قرار نہ پائے، اس وقت وہ ان قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسرے مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے، اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے یعنی وہ نئے نئے جنموں میں پیدا ہو کر سزا بھگتی ہے اور اس وقت تک اس آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے اچھے برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے اس لئے کامل اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام ہی صادر نہ ہو یعنی ترک عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد جب پھر نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا اور جنم کے آواگون کا چکر شروع ہوگا اور پھر اسی طرح چھٹکارا ملے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا۔ یہ چکر اسی طرح ہمیشہ جاری رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی چھٹکارا نصیب نہ ہوگا الا یہ کہ وہ کسی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بھارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے اور ہر قسم کا کاروبار معطل ہو کر یہاں بھی دنیا فنا کے قریب آ جائے اور یہاں کے ساتھ ہی اس کا وجود بھی دنیا سے مٹ جائے اور یہاں ہمیشہ کی وابدی نجات میسر نہ ہو کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔[1]

[1] [illegible] میں یہ مضمون ہے۔

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے کلی سے انسانوں کو نجات دلائی ہے انھوں نے اس موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا کی تعلیم دی ہے جس میں انسانوں کو اپنے اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی مختلف زردشتی فرقوں نے آرین نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی تقلید کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو "ارداے ویراف" کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔[1]

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۲۔۱۹) علاوہ بریں حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں اخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں نیکوکاروں کے لئے ایک "ابدی آبادی" کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں مذکور ہے اور بدکاروں کے لئے ہلاکت اور بربادی اور دردناک عذابوں کی بھی خبر ہے مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں ترجمہ کر کے دکھایا ہے حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے حضرت آدمؑ کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم (پیدائش ۲۵۔۸) اور یعقوب (پیدائش ۴۹۔۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ "جان دی اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا" ساتھ ہی ہمیشہ کی ہلاکی (استثناء ۶۔۲۳) کا بھی تذکرہ ہے اور جہنم کی آگ (استثناء ۳۲۔۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیئے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷۔۱۰) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳۔۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی ذکر ہے (واعظ ۱۲۔۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کا بھی تذکرہ ہے آخر میں خدا سے ڈرو اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری عدالت میں لائے گا۔ (واعظ ۱۲۔۱۳۔۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں اور امثال سلیمانی میں ہے کہ "انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانتا ہے شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکا پھرے گا (۵۔۲۱) دانیال میں ہے کہ اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سوتے ہیں جاگ اٹھیں گے بعضے حیات ابدی کے لئے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لئے (۱۲۔۲) حزقیل (۲۸) جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں[2] منجملہ ان کے وہ قیامت اور حیات اخروی کا بھی منکر ہوا مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی ([illegible]) کہا اپنے پرانے عقیدہ پر قائم رہا اور

---

1. دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے بڑی عقیدت رکھتا تھا اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے۔
2. برٹش انسائیکلوپیڈیا مضمون صدوقیت وغیرہ۔

قیامت، حیاتِ اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں فریسی بھی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت ابدی ہوگی اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی (مرقس ۱۸-۱۲۔۳۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزاء و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گنہگار ہوں، مگر چند روز سے زیادہ وہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (بقرہ۔۸۰، آل عمران۔۳) یہ چند روز باختلاف روایت تین روز، چالیس روز یا گیارہ مہینے لئے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے آکر صدوقیوں کے اس عقیدے کی تردید کی اور قیامت اور جزاء و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی۔ حضرت عیسیٰؑ کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰؑ کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ اس دنیا میں لوگ شادی بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند ہوں گے، ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا شیرہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں"۔ (متی۔۲۶-۲۹)

حضرت عیسیٰؑ یہودی علماء کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

"اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے" (متی۔۲۳-۳۳)

حضرت عیسیٰؑ اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا ایک منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابراہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو، اور اس نے پکار کر کہا اے باپ ابراہام مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں" (لوقا۔۱۶-۲۳)

مکاشفات یوحنا میں دوزخ کو "آگ اور گندھک" کہا گیا ہے (۱۴-۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں (متی ۱۶-۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی و جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے، اور وہاں کے انگوری شیرہ کا بیان متی میں ہے (متی ۲۶-۲۹) وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے (لوقا۔۱۲-۳۳)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لئے جانے اور عمل کے مطابق بدلے ملنے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں

---

۱ کتب سیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو۔

۲ نقل از ترجمہ قرآن حاشیہ ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۹۔

موجود ہے۔

"مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا" (رومیوں ۴-۸)

"سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب دے گا" (رومیوں ۱۴-۱۲)

"لیکن وہ اس کو جو زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے حساب دیں گے" (اول پطرس ۴-۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا فراہم کئے۔ گذشتہ مذاہب کے مختلف بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں اور ان کے نقائص کی تکمیل کی اور جزا و سزا کے اصول اس طرح بیان کئے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہو گیا۔

آئندہ مباحث کے سمجھنے کے لئے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

عالم آخرت کا فہم و ادراک:

اس عالم آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ و زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہوگا تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے ان الفاظ کے ساتھ جو مادی خصائص و لوازم مستلزم ہو گئے ہیں ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سن کر ہم بعینہ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں اور اسی سبب سے بعض کم فہم لوگ ان کے وقائع و احوال کو بیان سن کر ان میں سے بعض امور کو محال اور ناممکن سمجھتے ہیں اور بعض ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں اسی لئے وحی محمدی نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے۔ اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر اس عالم آخرت کو بھی سرتاپا عالم آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کو مادہ سے اتنا بلند و برتر کیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلافی مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہل نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی اور تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحی محمدی نے اپنے سچے تلے الفاظ اختیار کئے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لئے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی تاکہ وہ سب کے لئے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے۔ ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا کے تمام تر مادی احوال، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات ہر چہار طرف سے لپٹے ہیں ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سرتاپا انہی مادی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے ہم جب "آگ" کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اسی دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں جو انسانوں اور درختوں کو اور ہر چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے بلاتمیز یکساں جلا دیتی ہے مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی۔ اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائے گی کسی کے پاؤں

پھٹ جاتی ہے، کسی کی گردن تک آ جاتی ہے، کسی کے گلے تک پہنچتی ہے وہ ایسی تیز اور گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے۔ "وزن" کا لفظ سننے کے ساتھ ہمارے سامنے اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں آ جاتی ہیں ترازو، پامنگ، پلے، ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا، اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہتے ہیں تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری تیاریاں ہمارے ذہن میں آ جاتی ہیں اس بنا پر ان الفاظ کے سراسر لغوی معنوں اور اس کے قریب ترین مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلاف آراء کی بڑی گنجائش ہے اس لئے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اسی طرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے یا پھر ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں۔ اگر مراد الٰہی یہی تنگی ہوتی تو خدا تعالیٰ انسانی عقلوں کے اس اختلاف مراتب کا لحاظ کئے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا تاکہ اسلام تمام مختلف العقول انسانوں کے لئے عالم گیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ عالم آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لئے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ قوانین فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو ساتھ اس کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ ارباب عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلومات و حسیات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو تلازم ہے وہ محض عادی ہیں یعنی اس لئے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں، یہ نہیں کہ اس لئے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے۔

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علل و اسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں، نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں، وحی محمدی نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے۔

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ (ابراہیم۔۷)

جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائے گی اور آسمان (نئے آسمان سے)

تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری تھے اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آخرت کی حیات کے متعلق اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جزا و سزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے وهو الهادی للصواب۔

اصول جزا:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے جس کو اہل فلسفہ قوانین قدرت اور اہل مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لئے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصول فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مر جاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصول فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جس طرح اصول حفظان صحت کی عدم پابندی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح اصول تزکیہ نفس کی عدم پابندی سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے، پھر جس طرح وہ اصول حفظان صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعے سے وہ شفایاب بھی ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم و نتائج:

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر، ہر ایک کا ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خواص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح افیون سے نیند، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعیاتی اشیاء میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی (فزیکل) اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی اس تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے، اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے، انبیاءؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کے متعلق وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کے متعلق ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب و ثواب رد عمل ہے:

الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و رد عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور انسان کا ہر عمل شامل اور داخل ہے، یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے قرآن نے انہیں دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے عقاب کا لفظ

عقب سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں اس لئے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی عمل کے کرنے کے بعد لازماً آتا ہے۔ ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے جس کے معنی لوٹنے کے ہیں اس سے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزاء کے معنی میں بولا گیا ہے۔

اس ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو، چنانچہ قرآن پاک میں یہی فلسفہ ادا کیا گیا ہے۔

﴿ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (جاثیہ-۴)

جو تم کرتے تھے آج اسی کا بدلہ پاؤ گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردعمل (ری ایکشن) کا نام ہے، ایک اور جگہ ہے۔

﴿ لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ﴾ (طہ-۱)

تا کہ ہر جان کو اس کا بدلہ ملے جو وہ کرتی تھی۔

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا و سزا تمام تر ہمارے ہی اعمال کے نتائج و لوازم ہیں۔

﴿ فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴾ (نحل-۴)

تو ان کے برے کام ان پر پڑے اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا

غرض جزا و سزا ہمارے اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ ارشاد فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر پھیر دیتا ہوں تو جو کوئی بھلائی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔[1]

حصول راحت کا اصول:

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت کریں اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لئے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں عاجل یعنی موجود اور آجل یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ ہمیشہ موجود (عاجل) راحت کو پسند کر کے آئندہ راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گویا کہ نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آئند ہو مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ "نقد را بہ نسیہ مدہ" لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ مدبر کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈالتے ہیں تا کہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے، تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تا کہ دولت فراواں سے وہ بہرہ مند ہوں۔ ہر مہذب انسان اپنے بچوں کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تا کہ اس کی آئندہ کی زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو۔ لوگ اپنے سرمایہ عزیز کو

۱؎ صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۶۰ ... مختصراً بخاری باب الظلم

تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں تا کہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لا سکیں اور تنگ وقتی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لئے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لئے برباد کر دیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائیدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی قدر و قیمت اور اس کے دوام و پائیداری کا ہم کو یقین ہو کہ اگر یہ یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں یہ اسی لئے ایمان کی ضرورت ہے تا کہ ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی اسی لئے کمزور انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے۔

﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ، وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴾ (قیامہ-۱)

ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔

حالانکہ انسان اسی اصول کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ ہو۔ آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا ہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے۔ موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا۔ تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور روزانہ دھوپ کی محنت کو اس لئے قبول کرتے ہو کہ کل کی بڑی اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے۔ غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے۔

﴿ وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا ﴾ (دہر-۱)

اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے سا درجہ دے دی۔

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تا کہ آخرت کی بڑی تکلیف سے نجات ملے۔ یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ ﴿ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَ حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ ﴾ یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے۔ جو لوگ تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے ہیں اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلب گار رہتے ہیں اس سے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لا انتہا لذتوں سے شاد کام ہوں گے۔ یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے۔

﴿ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾ (نازعات-۲)

لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خواہشوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

نامۂ عمل:

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بے حکم خدا فنا نہیں ہوتی۔ اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فانی نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے آج موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں، وہ اعمال و افعال کے دوام وجود کے اسلامی عقیدہ کے قبول کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں کر سکتی۔ دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر قول و فعل ہمیشہ کے لئے گویا محفوظ ہوتا ہے۔

قرآن پاک نے اسی اصول کو انہی آیتوں میں بیان کیا ہے۔

﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ﴾ (یونس-۳)

اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا اس کو آزما لے گی۔

﴿ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ﴾ (طور-۱)

ہر آدمی اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔

﴿ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴾ (مدثر-۲)

ہر جان اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔

﴿ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ﴾ (زلزال)

تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو چیونٹی بھر برائی کرے گا وہ اس کو بھی دیکھے گا۔

﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوءٍ ﴾ (آل عمران-۳)

جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کئے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کئے ہوں گے۔

یہ بات کہ انسان کا ہر قول و فعل صحیفہ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب بھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے خدائی شاہد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

﴿ إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ﴾ (ق-۲)

جب وہ لینے والے دائیں اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں کوئی بات وہ نہیں بولتا مگر ایک نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔

کبھی اس کو اعمال کی تحریر کردہ کتابت کے الفاظ میں تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴾ (زخرف-۷)

اعضاء کی شہادت:

انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا چھپا یا کھلا اثر چھوڑ جاتا ہے اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے فرمایا:

﴿ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ﴾ (قیامہ-۱)

بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے اگر چہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے عمل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم ﴾ (مطففین)

نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

اسی آیت کی تفسیر میں گویا آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آئندہ کو اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کئے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔[1]

اسی طرح سے وہ اپنے اعضاء جن سے جو برا کام کرتا ہے اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالم غیب کو چھوڑ دو اسی عالم ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں انسانوں کے چہروں، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوان بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ سکتی ہیں اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار و نتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے۔

﴿ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ ﴾ (رحمان-۲)

گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لئے جائیں گے۔

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبان قال پر خداوند عدالت کے رعب و جلال سے مہر سکوت لگ جائے گی، اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک نفس انسانی کے اعمال بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فرمایا۔

﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ...... الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴾ (یٰسین-۵۹-۶۵)

اے گنہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ جاؤ...... آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

﴿ وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ، حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ، وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (حم سجدہ-۱۹-۲۱)

---

1 ترمذی

اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ وجہ بجوجہ بانٹے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی اور انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔

اس لئے ان اعضاء کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لے کر تسکین پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان:

اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ، وزن ہمارے روزانہ کی چیزوں کے درمیان تفاضل اور کمی بیشی کا علم ہم کو تول لینے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لئے وزن اور حساب سے مراد عدل و انصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے، اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا فرمایا۔

﴿ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴾ (النباء-۱)

پورا پورا بدلہ۔

اس برابری اور کامل عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی زبان اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا فرمایا۔

﴿ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ. وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾ (اعراف-۱)

پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے اور وزن اس دن حق ہے پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہی جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی ہوئیں سو وہی ہیں جو اپنی جان ہار بیٹھے۔

﴿ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ. فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ. وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ. فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴾ (القارعہ)

تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہوگی۔

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی بیشی ہے پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق اور عدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الٰہی میں موجود ہوگا اور وہ کسی طرح بیش و کم نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے، ایک جگہ ہے۔

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ﴾ (الشوریٰ-۲)

وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان کو۔

یعنی کتاب الٰہی حقانیت کے ساتھ اتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال قائم رکھا ہے اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے۔

﴿ وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ﴾ [رحمٰن]
اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔

حساب:

نیکی بدی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب کرنے کا ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے، مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے چنانچہ سورۂ انبیاءؑ میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے فرمایا۔

﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ ﴾ [انبیاء-۴]
اور ہم قیامت کے دن کے لئے ترازوئیں ٹھیک انصاف رکھیں گے، پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم سامنے لائیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جا سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے، اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی ذرہ بھی معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے لیکن بہرحال وزن وحساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر کوئی سچ باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت و دوزخ:

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ روح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی عطا کی جائیں مگر اس سعادت وترقی کی بنیاد خدا نے اعمال نیک کے حصول اور اعمال بد سے پرہیز پر رکھی ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقت انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی ملتی ہے "بہشت" ہے اور اس عالم کا نام جہاں جا کر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ حیات فانی کے اعمال بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوتی "دوزخ" ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے:

حضرت آدمؑ کا قصہ جو توراۃ اور قرآن پاک میں مذکور ہے وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں بلکہ وہ حقیقت انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دے دی گئی تھی مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لئے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیئے گئے مگر ایسا کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آدمؑ کا زمین میں آنا ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقرر

ہو چکا تھا' کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (بقرہ۔۴)

میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے' مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے' مگر اس سے دوری اس کے گناہ کی وجہ سے ہے' اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا' چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا۔

﴿قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (بقرہ۔۴)

ہم نے کہا تم سب اس جنت سے اترو' پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم اور جنہوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ والے اور وہ اس میں رہا کریں گے۔

﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ۝ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ﴾ (طٰہٰ۔۱۲۳۔۱۲۴)

خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کے لئے تنگ معاش ہوگی اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

توراۃ میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا' توراۃ کی رو سے آدم کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے' لیکن آدم نے اس کو کھالیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا' آخر خدا نے ان کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں' جب وہ جنت سے نکالے گئے تو ان سے کہا گیا

''اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا' زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا' جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے'' (سفر تکوین۔۳)

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کا پھل کھانے سے آدم کو روکا گیا تھا تصریحاً مذکور نہیں' لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا اور شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ'' یہ حیات جاوید اور ملک جاوداں کا درخت ہے'' مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو'' برہنگی کا علم'' ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔

﴿ فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ۔ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا ﴾ (طٰہٰ-۱۲۱)

فرمایا شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا اور کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیات جاودانی اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں
تو [آدم اور حوا] دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو ان کی برائی چیزیں ان پر کھل گئیں

اب سوال یہ ہے کہ "حیات جاودانی" اور غیر فانی بادشاہی سے مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جنت سے شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو ہے، دوسری ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل کھایا۔ یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے بھی بری اور بے نیاز ہے۔ غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی فرمایا۔

﴿ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴾ (الشمس)
اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم! پھر نفس میں اس کی بدی اور اس کی نیکی کا الہام کیا۔

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

﴿ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۔ لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴾ (احزاب-۷۲-۷۳)

ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اس کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا تاکہ اللہ منافق والوں اور منافق والیوں شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیف شرعی کی امانت کو اٹھالیا جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور اس تکلیف شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس کی رحمت و شفقت کا اقتضاء یہی ہے کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشتکار اپنے کھیتوں کو ابر رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحت الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیات جاودانی اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول تقاضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جدوجہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا اور جسے شیطان نے آدم کو بلا کسی محنت محض جنت و اتفاق سے دلوانا چاہا تھا اس کا ملنا تقدیر الٰہی اور نظام ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی و جدوجہد

اور اس کے مطابق سعی و عمل کرے، یہ سب مقرر ہوا جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا فرمان آیا:

﴿اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (بقرہ-۴)

یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو ان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔

﴿اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ﴾ (طہ-۱۲۳)

تم دونوں یہاں سے نیچے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ بدبخت۔

جب انسان کا اصلی مقام وہی حیات جاوید اور مملکت ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہئے اور اسی حیات باقی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے ذریعہ معاوضہ میں حاصل کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے

﴿فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ۝ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ﴾ (طہ-۱۱۷-۱۱۹)

تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کردے تو پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ، اور جنت میں تم کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا نہ ننگا، نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش پائے گا۔

آدم جب جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی اور ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی ان کو معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی بھی تکلیف ہوئی اور زمین میں آکر انہیں چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہونا پڑا، کھانا، پینا، پہننا، رہنا۔ یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں اور انہیں کو اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر اس نے ضروریات کا ایک عالم پیدا کرلیا اور انہیں کے تیار کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور جمع کرنے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کردیا اور اصلی جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا، جس سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصول معاملات اور اخلاق انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لئے تاکہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیات غیر فانی کی طلب کو بھول نہ جائے عرفان الٰہی (عقائد صحیحہ) اور عبادت و اطاعت الٰہی کی تلقین ہوئی جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے۔

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (مومنون-۱)

یہی وہ میراث لینے والے ہیں جو سدا بہار باغ کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

لیکن یہ دولت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعہ ملے گی چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلے کے وقت یہ بشارت... ملے گی۔

﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ. وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (زخرف۔۷)

اور اس جنت میں وہ نعمت ہے جس کو دل چاہتا ہے اور آنکھوں کو لطف ملتا ہے اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم اپنے کاموں کے بدلہ میں جن کو تم کرتے تھے وارث بنائے گئے۔

اور ان کو منادی یہ کہہ کر پکارے گا۔

﴿ وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (اعراف۔۵)

اور ان کو پکار کر کہا گیا کہ یہ وہ جنت ہے جس کے تم اپنے ان کاموں کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے وارث بنائے گئے۔

ملت توحید کے مؤسس اعظم حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا۔

﴿ وَاجْعَلْنِي مِن وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ﴾ (شعراء۔۵)

اور مجھے نعمت کے باغ کے وارثوں میں کر۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے جہاں نہ بھوک ہے نہ پیاس نہ برہنگی ہے نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی ہر شے لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے جس کے مجموعہ کا نام "تقویٰ" ہے۔

﴿ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَن كَانَ تَقِيًّا ﴾ (مریم۔۴)

یہ وہ بہشت ہے جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے جو تقویٰ والا ہوگا۔

انسانی جزا و سزا کے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالم موت یا عالم قبر جس کا نام برزخ ہے اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دار آخرت کہتے ہیں۔ یہودیوں کے یہاں اصلی دارومدار اسی دنیا کی جزا و سزا پر ہے ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم اور دوسرے کا مطلق نہیں اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدی کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی سزا و جزا کا مقام قرار دیا ہے انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا و سزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سزا کا منظر دیکھتی ہے اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا تو فانی انسان بھی دائمی زندگی کے لئے پیدا کیا جائے گا اور اس وقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزا و سزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دار الجزاء:

انسان کا پہلا دار الجزاء یہی دنیا ہے۔ گو انسان کے ہر نیک و بد عمل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی میں ملتی

﴿ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴾ (نحل۔۳۰)
جنہوں نے نیک کام کئے اس دنیا میں ان کے لئے بھلائی ہے اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی فرمایا

﴿ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ﴾ (حج۔۲)
اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔

﴿ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾ (بقرہ۔۱۴)
ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑی مار ہے۔

﴿ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴾ (بقرہ۔۲۷)
ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔

اور ان کے متعلق یہ بھی فرمایا۔

﴿ فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴾ (آل عمران۔۶)
تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے

﴿ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ﴾ (طہ۔۷)
اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لئے تنگ گذران ہے اور قیامت میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا تھا۔

انتہا یہ ہے کہ خود صحابہ کو جنگ احد میں جو شکست ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان کی بعض فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ﴾ (آل عمران۔۱۶)
تم میں سے بعض لوگ اس دن جب دونوں فوجیں لڑیں جو پیچھے ہٹے ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا۔

﴿ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ﴾ (شوریٰ۔۴)
جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے۔

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے عذاب کے موقع پر فرمایا۔

﴿ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴾ (آل عمران۔۱۲)

تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے

اس دنیا کی ذلت و رسوائی تو شاید سہہ لی جائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہہ سکتا ہے کہ

﴿ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ ﴾ (طٰہٰ۔ ۷)

آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیر رہنے والا ہے۔

اس لئے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کی بدولت جو زر و قوت، جاہ و جلال نعمت و مال اور حکومت و سروری سے ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہئے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائیداری حاصل ہوگی۔ اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

﴿ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ﴾ (قصص۔ ۷۷)

اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور اس دولت سے زمین میں خرابی نہ چاہ۔

چنانچہ نا خلف یہود پر تباہی اسی لئے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جاہ و مال کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا۔

﴿ فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ ۚ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَّا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴾ (اعراف۔ ۱۶۹)

تو ان کے بعد کچھ نا خلف کتاب کے وارث ہوئے جو اس دنیا کے سامان و اسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا ہی سامان و اسباب پھر آئے تو پھر لیں۔ کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

یہ دار الجزاء دار الاصلاح بھی ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا اور اسے ہمیشگی کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتایا کہ اس مقام کا دائمی و ابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو ہو سکتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی اسی لئے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدا بہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے مگر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور و فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے سدھرنے اور کامیاب بننے کے مواقع عنایت کئے اور رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ اور گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر اور عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار و کدورت کے

لوازم اسی لئے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی عنایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لئے حسب ذیل مراتب مقرر کئے۔

۱۔ نیکی سے برائی کا کفارہ: چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا اس لئے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے اسی کا نام کفارہ عمل ہے چنانچہ وحی محمدی نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ:

﴿ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ (ہود۔۱۰)

بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں

اس آیت کا یہ بھی منشاء ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوشخبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پچھلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں۔

﴿ إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴾ (نساء۔۵)

تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے اگر ان میں کی بڑی باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

﴿ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (مائدہ۔۳)

البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے تو میں تمہارے گناہوں کو اتاروں گا اور تم کو ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ﴾ (احقاف۔۱۹)

یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگذر کریں گے اور یہی ہیں رہنے والے جنت کے۔

۲۔ توبہ کفارہ ہے: انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لئے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرے تو اس کا نام توبہ ہے یہی توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی خدا کے آغوش محبت میں لا کر ڈال دیتی ہے آدم کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمت الٰہی کے رجوع کے واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کے لئے ہمیشہ وا رہتی ہے رحمت الٰہی کے اس پر جوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے اس سے ہندوستان کا برہمت اور دھرم قطعاً محروم تورات خاموش زبور کی

سرائیلی آواز دھیمی اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا

﴿ إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ﴾ (مریم-۴)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کئے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ یہ توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی

﴿ إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴾ (فرقان-۶)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اور یہی اس کی شان رحمت کا اقتضا ہے یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان کو بھی بشارت ہے۔

﴿ فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (مائدہ-۶)

تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سنوارا تو بے شک اللہ اس پر رجوع ہوگا کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ کلی اصول ظاہر فرما دیا کہ:

﴿ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ ﴾ (طہ-۴)

اور بے شک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کئے اور پھر راہ پر چلا۔

لیکن یہ توبہ کس کے لئے ہے اور کن شرطوں کے ساتھ ہے۔

﴿ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ﴾ (نساء-۳)

اللہ کو ان کی توبہ قبول ضرور کرنی ہے جو نادانی سے برا کام کر بیٹھتے ہیں پھر جلد توبہ کر لیتے ہیں تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے جو برے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا کہ اب میں نے توبہ کی اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے اور اس کے بعد اتفاقاً موت آجائے

تو یقیناً رحمت الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی۔

﴿ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

(اعراف-۱۹)

اور جنھوں نے برے کام کیے پھر اس کے بعد توبہ کی اور یقین کیا تو بے شبہ تیرا پروردگار اس کے بعد بھی بخشنے والا اور اس پر رحم کرنے والا ہے۔

﴿ وَمَن يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴾ (نساء-۱۶)

اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو وہ خدا کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔

۳۔ مصائب کی تنبیہ اور کفارہ

دنیا میں مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز انسان کو کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہوشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی کمالات کے جوہر مصیبتوں ہی کی آگ میں نکھر کر کندن بنتے ہیں۔ صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت انھیں مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے۔ مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے تو سنبھل جاتا ہے، اس لئے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لئے کبھی کبھی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ ان کی بدولت غافل سے غافل انسان بھی ایک دفعہ بیدار ہو کر خدا کا نام لینے لگتا ہے۔

دولت، راحت اور کامیابی و مسرت شراب ہے جس کے نشہ کا اتار مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہوا اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے تو دفعۃً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگ دستی، عزیزوں کی موت، آرزوؤں کی ناکامی ان میں سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھا کر مست سے سرمست راہگیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لئے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ دینے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی سی تکلیف سے بعد میں جو روحانی احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے، تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و اصلاح کی فکر کریں، فرمایا۔

﴿ وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴾ (اعراف-۱۶)

اور بے شک ہم نے فرعون والوں کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے۔

﴿ وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴾ (اعراف-۲۱)

اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا تاکہ وہ باز آئیں۔

اسی سورہ میں آگے اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ﴾ (اعراف۔۱۲)

اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا تاکہ عاج
وہ گڑگڑائیں۔

مسلمانوں سے فرمایا گیا۔

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ (بقرہ۔۱۹)

اور البتہ ہم تم کو تھوڑے سے خوف، بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو خوشخبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔

اسی اصول کے تحت احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری ﴿مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ﴾ (نساء۔۱۸) جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا تو میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا مطلب پوچھا فرمایا کہ "یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے عتاب ہے اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کو ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے جیسے اس کو بخار آ جائے یا وہ کسی مصیبت سے دوچار ہو جائے یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچے وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا[1] دوسری صحیح روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے" تیسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا فکر یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی" چوتھی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہنچے اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔" پانچویں روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی تو وہ اس کے لئے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک و صاف کرنے والی ہے۔"[2]

سطور بالا سے معلوم ہوا ہے کہ کوئی انسان جو اقرار توحید کے بعد گناہ میں ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ، اعمال نیک اور مصائب پر صبر و شکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک و صاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے

---

1. یہ روایتیں بالمعنی ماخوذ ہیں اصل الفاظ کتب حدیث میں ہیں مثلاً ترمذی تفسیر سورۂ نساء، [illegible] کتاب الجنائز۔
2. یہ کل روایتیں کتاب المرضی میں صحیحین وغیرہ میں ہیں۔

بعد اس کو کسی نئے کفارہ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی لئے قرآن پاک میں ہے۔

﴿ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴾ (سجدہ۔۲)

اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب سے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھاتے ہیں تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذاب الٰہی کا مقصد انتقام اور نفس سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا۔

﴿ مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴾ (نساء۔۲۱)

اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں) کا قبول کرنے والا اور (تمہارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے۔

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوتا ہے اور عالم برزخ اور عالم بعث میں چونکہ نئے عمل کے محل نہیں، اس لئے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوسکتا' صرف گذشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے اور یہی عالم برزخ اور عالم بعث کے عذابوں کا مقصد ہے اِلّا یہ کہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عذاب برزخ بھی کفارہ ہے:

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمال بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک وصاف بننا پڑے گا' یہی عالم برزخ کا عذاب ہے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لئے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے میں جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے اس کو برداشت کر کے اچھے کام جو نہیں کئے ' ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آ کر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں تاکہ حیات ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک وصاف ہوسکیں تو پاک وصاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں، جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے یعنی ان کی جگہ ہے جو سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے مگر اعمال نیک' توبہ اور مصائب میں صبر وشکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پا سکے۔

یہ بات کہ عذاب برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے' قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے نکلتی ہے۔ اور یہ اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے اس بناء پر عذاب برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا' قرآن پاک کی اس آیت سے بھی یہ بات کنایۃً نکلتی ہے۔ گنہگار حشر کے دن کہیں گے

﴿ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ﴾ (انعام۔۱۵)

اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا پہنچ چکے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دور کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمرؓ ان طول مقام امتی فی قبورهم تمحیص لذنوبهم (کنز العمال باب عذاب القبر جلد ۷ ص ۱۲۰)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

﴿ الضغطة فی القبر کفارة لکل مومن لکل ذنب بقی علیه ولم یغفر له ﴾ (ایضاً)

یعنی قبر کی تنگی مومن کے گناہ کا کفارہ ہے

اسی لئے ایک اور حدیث میں آیا ہے

﴿ اکثر عذاب امتی فی قبورهم ﴾ [1]

میری امت (کے لوگوں) کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔

اس حدیث کا (اگر روایت ہو تو) منشاء یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر افراد اپنی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک و صاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی۔ حافظ ابن القیم ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

﴿ فان وفت بالخلاص منها فی هذه الدار والا ففی البرزخ فان وفی بالخلاص والا ففی موقف القیامة واهوالها ما یخلصهم من تلک البقیة ﴾ [2]

اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لئے پورا ہو گیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے ان کا علاج کیا جائے گا تو اگر یہ نجات کے لئے کافی ہو گیا تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلائیں گی۔

رویائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گذر چکی ہے وہ منظر بھی دکھایا گیا ہے جس میں گنہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیوت میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پاتے ہیں [3] غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے۔

﴿ ویوم یحشرهم جمیعا یمعشر الجن قد استکثرتم من الانس وقال اولیاؤهم من الانس ربنا استمتع بعضنا ببعض وبلغنا اجلنا الذی اجلت لنا ﴾ (انعام ۱۵)

اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا اے گروہ جن تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا اور ان کے دوست

---

1. یہ حدیث [illegible] نے [illegible] عذاب [illegible] میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا اصل ماخذ معلوم نہ ہو سکا۔
2. شفاء العلیل ابن القیم مطبعہ حسینیہ مصر ص ۲۰۰
3. [illegible] ابن حجر [illegible] مصر۔

انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا اور ہم مقررہ وقت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرا رکھا تھا۔

یہ الفاظ کہ "ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا پہنچ چکے" یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دور عذاب ہم ختم کر چکے اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس لئے بعض دوسری قسم کی مخلوقوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے، جواب ملے گا

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴾ [انعام۔۱۵]

فرمائے گا آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں سدا رہو گے لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے بے شک تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے۔

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی تمام نہیں ہوئی اس لئے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے پھر جب خدا چاہے گا تم کو اس سے نجات دے گا۔ اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے علم و حکمت اور مشیت کا جب تقاضا ہو گا تم کو نجات ملے گی۔

عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے:

بھی بیان ہے اور پر مذکور بھی ہے کہ

﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴾ (نساء۔۲۱)

خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام، اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ وہ تمہاری شکر گذاری کو قبول کرنے والا اور تمہارے دلوں کے حال کو جاننے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ گنہگار کو جو عذاب ملے گا اس میں اللہ کو کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے گنہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیئے ہیں وہ ان کو توڑتا بھی نہیں جس وقت آدمؑ کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لئے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لئے حاصل کریں اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا۔

﴿ اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۴)

یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور جنہوں نے ناشکری کی اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے ہوں گے۔

اس آیت میں مستحق دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک کفران اور دوسری تکذیب۔ دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذاب دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بالمقابل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاق جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاق دوزخ کے اسباب ہیں بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروع اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

میں مصروف ہوگی۔ اور جونہی وہ ان سے عہدہ برآ ہوگی، خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لئے قید خانہ ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کے لئے شفا خانہ ہے بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں، درد اعضا شکنی، شدت تشنگی، سوزش جسم اس کو وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے، اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری ایذا رسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے عدم صحت کی غلط کاریوں کے نتائج بد سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے اور جو تکلیفیں اس کو وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں، بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیات اور ان احادیث کے سمجھنے سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذاب دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے۔

﴿ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (آل عمران۔ ۱۴)

اور تا کہ خدا ایمان والوں کو پاک و خالص کرے اور کافروں کو مٹائے۔

یہی اصول عذاب اخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہل ایمان کی پاکی و صفائی ہے، چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوق عباد کے بعد ﴿ حَتّٰى اِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا اُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ ﴾ (صحیح بخاری باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷) یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں گے اور پاک و صاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔

اس حدیث میں یہ دو لفظ ﴿ هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا ﴾ ذرا تشریح طلب ہیں ﴿ هُذِّبُوْا ﴾ کا مصدر تہذیب ہے تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لئے چھانٹ دی جائیں تا کہ درخت میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو کر ترقی کی نئی زندگی اس کو مل جائے اور ﴿ نُقُّوْا ﴾ کا مصدر تنقیہ ہے تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے تا کہ وہ پوری طرح نکھر جائے۔ اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لئے کیا درکار ہے؟ اسی لئے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی۔

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ (زمر۔ ۸)

تم پاک و صاف ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لئے آ جاؤ۔

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملے گی اسی لئے ہر گنہگار کے لئے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہر حال اس کی انتہا بے فرمایا۔

﴿ لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴾ (نبأ)

دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔

لیکن بالآخر ان مدت ہائے سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیث معراج کے بیان میں ہے کہ آپ ﷺ نے دوزخ میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کئے تھے ان کا آدھا حصہ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت تھا جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ، سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سفید پانی بہہ رہا تھا، وہ اس میں جا کر پڑ گئے پھر نکل آئے تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہو گئے (صحیح بخاری کتاب التعبیر) اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گنہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے؟

اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گنہگاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود بیماروں کے لئے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہگاروں کی پاکیزگی اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی، اس رحمان و رحیم کی رحمت و کرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لئے محروم و معذب رکھے اس لئے ان کی صفائی کے لئے پہلے برزخ کا مقام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں ان کے لئے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں۔ اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھئے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنتَصِرَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْأَلُ عَن ذَنبِهِ إِنسٌ وَلَا جَانٌّ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ۝ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ (رحمٰن۔۳۵۔۴۵)

تم پر آگ کے صاف اور دھوئیں ملے شعلے چھوڑے جائیں گے پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس و جن سے اس کے گناہ کی نسبت نہ پوچھا جائے گا تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، گنہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لئے جائیں گے پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ یہ وہ دوزخ ہے جس کو گنہگار جھٹلاتے ہیں وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیتوں کی تفسیر کسی بھی پہلو سے کیجئے یہ بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں کے حق میں نعمت ہیں اس لئے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں اور اس

سے بھی کہ آخرت میں وہ آتش کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ میں رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات:

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا اور رسول کی صداقت کا معترف خواہ کس قدر گمراہ اور گنہگار رہو تاہم اس کے نامہ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب و جلال کا روز ہوگا جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا خمیازہ ہو ناپڑے گا مگر بالآخر اس رحمان و رحیم کی شان رحیمی کا ظہور رہو گا اور "رحمتی سبقت غضبی" (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کے مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا اور گنہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک وصاف کر کے پاکوں کو بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ ﴾ (تغابن۔ ۱)

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (توبہ۔۱۳)

اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد شاید اللہ ان کو معاف کرے بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس معافی کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کردے دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر وہیں سے نکلیں فرمایا:

﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۚ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾

اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو، تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے پھر ہم ان کو جو خدا سے ڈرتے تھے بچالیں گے اور شریروں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

احادیث صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں۔

۱۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے"۔ (صحیح بخاری کتاب الرقاق)

۲۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "دوزخ سے کچھ لوگ اس کی تپش کھا کر نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے"۔ (ایضاً)

۳۔ حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو خدا فرمائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے، پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیئے جائیں گے تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے"۔ (صحیح بخاری کتاب الرقاق)

۱۳۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ "حکم ہوگا کہ جس نے ﴿لا الٰہ الا اللہ﴾ کہا ہو اور اس کے دل میں جو برابر بھی نیکی رہی ہو اس کو دوزخ سے باہر کرو، جس نے ﴿لا الٰہ الا اللہ﴾ کہا ہو اور گیہوں کے دانے کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے ﴿لا الٰہ الا اللہ﴾ کہا ہو اور جوار کے دانے کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اس کو دوزخ سے الگ کر دو۔ (ترمذی صفۃ النار، حدیث حسن صحیح)

احادیث کی کتابوں میں ان معنوں کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا مفہوم موجود ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (نساء۔۔۔۴۸)

بے شک خدا اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہے وہ اس کو جس کے لئے چاہے گا معاف کر دے گا۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجے سے براءت کی جا سکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اس لئے اس کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانون عدل کے خلاف ہے۔

شرک و کفر کی بخشائش نہیں:

احکام الٰہی اور شریعت رسالت کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے جو گویا اصل کے ہے اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم، اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں، اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضاء اور جوارح سے ہے اس کو ہم بہ تعبیر اعمال اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک و کفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے ہے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دل میں ایمان و یقین و عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ میں روشنی کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے مگر جس کاشانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے بہرہ ور ہونے کے لئے ناامیدی ہے اسی لئے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمال شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے جن کی دوزخ کے عذاب اور رحمت الٰہی سے تلافی ہو کر نجات مل سکتی ہے۔ ایمان، علم و عرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آ جاتے ہیں، ہماری سعی کا نتیجہ بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا اس بنا پر شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانون الٰہی میں ناممکن ہے البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لئے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں کسی امتحان کے لئے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے، اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس نے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لئے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحم دل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب

عرش کے اوپر یہ لکھ دیا کہ ﴿ إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي ﴾ ؎ "میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔"

اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے اس کی جنت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے یا برابر ہو جاتا ہے اور اس کا تخیل بھی اس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا اور ننانوے حصے قیامت کے دن کے لئے رکھے ہیں (صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ) اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب آ جائے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہ وہ دن ہوگا جب گنہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بن جائیں گے۔

اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں اور جو اس وقت تک نجات نہ پائیں گے جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم شعلہ بھی باقی ہے تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں

﴿ لَابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ﴾ (نبا-۱)

وہ دوزخ میں صدہا ہزارہا سال ٹھہریں گے۔

صدہا ہزارہا سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو پھر بھی ایک دن اس کا خاتمہ ہے۔ دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے یہ ہے:

﴿ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴾ (انعام-۱۵)

دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں تم سدا رہنے والے ہو لیکن یہ کہ خدا جو چاہے بےشک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں تو یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے مگر اس کی رحمت کا تقاضا کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم و علیم ہے اس لئے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہئے اور کب کرنا چاہئے۔

تیسری آیت میں ہے۔

﴿ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴾ (ھود-۹)

وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے بےشک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

دوسری اور تیسری دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو غالب بتایا ہے اور اپنے کو "رب" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ربوبیت کا اقتضاء ہے قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقاء دوام، عدم انتہاء اور تسلسل وجود پر تصریح استدلال کیا جا سکے حالانکہ اس کے برخلاف جنت کی ہمیشگی و بقا اور عدم انقطاع و عدم فنا کی

۱؎ صحیح بخاری [illegible] کتاب [illegible] صحیح مسلم جلد دوم صفحہ ۳۵۶ [illegible]

مذہبی آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں، چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس موقع پر دالی آیت کو ہم تمام وکمال یہاں نقل کرتے ہیں فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ (ہود - ۹)

تو لیکن جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور ہانپنا ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اسی دوزخ میں رہیں گے مگر جو چاہے تیرا رب، بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔

دیکھو کہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لئے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استثنا فرمایا، مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ ”مگر جو چاہے تیرا رب، بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے“ اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کردے اور چاہے تو قائم رکھے لیکن اہل جنت کے دوام کے ذکر میں تصریح فرمائی ”مگر جو چاہے تیرا رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی“ اس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر مختتم دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد آئمہ سلف مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے لیکن اہل دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے۔[1]

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ (بینہ)

بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں (جا) پڑے رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ بہترین لوگ ہیں ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک ہمیشہ کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں وہ اس میں ہمیشہ ابد الآباد رہیں گے۔

غور سے دیکھو کہ اس میں اہل دوزخ کے مقابلہ میں اہل جنت کے دوام میں کتنی تاکید پر تاکید ہے پہلے عدن فرمایا جس کے معنی ”قیام“ اور ”رہنے“ کے ہیں پھر ”خالدین“ کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے بعد ازیں ”ابدا“ فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے

﴿ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾

[1] تفسیر طبری و ابن کثیر وغیرہ بذیل تفسیر آیات سورۂ ہود و انعام وغیرہ۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ (تغابن۔۱۰)

اور ان کو ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔

دیکھو کہ یہاں دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور ﴿خالدین فیها ابدا﴾ (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے کہیں جو کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کے تعین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرمادی گئی ہے[1]

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (آل عمران)

جس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ تو جو سیاہ ہوئے تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے منہ سفید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔

آیت بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تام ہے۔

انہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ اور بعض صحابہ کرامؓ سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا جب دوزخ کے میدان میں ہو کا عالم ہوگا اور کوئی ایک شخص بھی وہاں نظر نہیں آئے گا، چنانچہ:

۱۔ طبرانی میں حضرت ابوامامہ صحابیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جہنم پر ایک ایسا دن آئے گا جب وہ خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گا اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔"

۲۔ حضرت جابرؓ یا کسی اور صحابی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔"

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔

۴۔ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ "انہوں نے فرمایا کہ اہل دوزخ ریگستان عالج کے ذرات کے شمار کے بقدر بھی دوزخ میں رہیں، پھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اس سے نکلیں گے۔"

۵۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ "جہنم پر ایک دن آئے گا کہ جب اس کے خالی دروازے بجیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کر چکے۔"

۶۔ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ صحابی یا ابوسعید خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے یہ فرمایا کہ "﴿إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ﴾" کا استثنا پورے قرآن پر حاوی ہے یعنی جہاں جہاں

قرآن میں خالدین فیہا (ہمیشہ اس میں رہیں گے) اور ان پر مشیت الٰہی کا استثنا قائم ہے۔

۷۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا جب اس کے خالی دروازے کھڑکھڑایا کریں گے۔[1]

دفع شبہ

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوتا ہے مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو "خالدین فیہا ابداً" ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

۱۔ ﴿ إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ۝ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ (احزاب۔۸)

بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

۲۔ ﴿ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ (جن۔۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے جہنم کی وہ آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

۳۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ۝ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ (نساء۔۱۶۸، ۱۶۹)

بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ خدا ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان تینوں آیتوں میں ﴿خالدین فیہا ابداً﴾ (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت دوزخ میں ہمیشہ قائم رہیں گے جب تک حسب مشیت الٰہی دوزخ کے فنا کا دور نہیں آئے گا۔

باقی چند آیتوں میں لفظ ابداً (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالدون ہے جیسے ﴿هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ وہاں بھی "خالد" رہنے کے ہیں یا ایک جگہ ہے:

﴿ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (سجدہ۔۲)

اور "خلود" کے عذاب کا مزہ چکھو۔

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے کہ خلود کے دو معنی ہیں ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور چولہوں کے پتھروں کے لئے خوالد اور خالدات کے الفاظ صفت میں آتے ہیں کیونکہ وہ دیر اور زمانہ دراز تک باقی رہتے ہیں۔ اسی سے معلوم ہوا کہ تنہا ﴿خالدین﴾ کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ

[1] حافظ ابن قیم نے شفاء العلیل (ص ۲۵۸) میں اس روایت کو بہ سند متعدد کتب تفسیر و حدیث سے نقل کیا ہے ان میں سے بعض روایتیں طبری میں بھی آیات مذکورہ کی تفسیر میں مختصراً تفسیر سورۂ ہود جلد ۱۲ ص ۶۶ تک مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر در منثور جلد ۳ ص ۳۵۰ میں بروایت عبد بن حمید ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی ص ۲۳۳ مطبوعہ الٰہ آباد میں بھی یہ روایت ہے۔

ہو جو دوام کے معنی کی تخصیص کردے جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے جہاں اہل جنت کو خالدین کہا گیا ہے، تقریباً تیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں اس لئے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف خالدین بھی ہے وہاں ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لئے جائیں گے برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خالدین کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں اس لئے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار زمانہ دراز تک دوزخ میں رہیں گے تاہم یہی وجہ ہے کہ گنہگار اہل ایمان کی سزا میں بھی خالدین کے ساتھ ابداً استعمال نہیں کیا گیا ہے، گنہگار اہل ایمان میں سے سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو مگر اس کے لیے بھی خالدین کے ساتھ ابداً استعمال نہیں کیا گیا فرمایا ﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا﴾ (نساء ۔۱۳) اور جو کوئی کسی با ایمان کو قصداً قتل کردے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے جس میں وہ خالد (یعنی مدت دراز تک) پڑا رہے گا۔

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہل اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر نجات کے قائل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں "خلود" سے مراد ہمیشگی نہیں ہے بلکہ زمانہ دراز ہے کہ اہل توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے اور اس لئے مومن کے لئے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہو سکتا بنابریں ان آیتوں میں خلود کے معنی مطلق دوام نہیں۔ بلکہ عرفی دوام یعنی مدت دراز کے ہیں ۔ ہم عام طور سے مجرم کے لیے حبس دوام کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد کبھی ابد تک یا قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ عمر بھر بھی نہیں بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی دراز ترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے۔ کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی تقریب عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ گنہگار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے، چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) ﴿إِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ، يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ، وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ﴾ (انفطار)
بے شک گنہگار دوزخ میں ہیں، وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپ نہیں سکتے۔

(۲) ﴿وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا، كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ﴾ (بقرہ ۔۲۰)
اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے بھی الگ ہو جاتے جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔

(۳) ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ، يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ﴾ (مائدہ ۔۱۳۰، ۱۳۰)

اہل اس رحمان و رحیم اور عفو و غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں اس لئے گنہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا اپنی حکمت و مصلحت کی بناء پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ چنانچہ مسند ابویعلیٰ میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا لیکن جس کسی کو اس نے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔"[1]

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک و صاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات و کنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا کہ اس سے ان کے نادم و تائب ہونے کے بجائے ان میں اور خود سری گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان میں آئندہ کے نتائج بد سے نڈر رہنا اور بے خوفی آ جاتی اور یہ شریعت کی تنبیہ و اصلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا اس لئے ان کی قانونی سزا تو دائمی عقاب مقرر فرمائی اور بالآخر ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر ان کو ایک گونہ اپنے سے نا امید بھی نہیں ہونے دیا اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور توبہ کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعۃً معاف ہو جاتے ہیں اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا۔ اس کے برخلاف ہندو مذہب نے تو خدا کو ایسا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں خدا چاہے بھی تو وہ کبھی معاف نہیں ہو سکتے لیکن اسلام نے آ کر ان دونوں غلطیوں کو برابر کر دیا۔ ایک طرف فرمایا ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ﴾ "ہر شخص اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے" (مدثر-۲) اور دوسری طرف فرمایا ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ﴾ "خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے" (مائدہ-۳) یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا قطعاً پابند ہے مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں جن کو آپ قانون فطرت کہتے ہیں مگر پھر بھی اس کا حکم اور اس کی خوشی اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچا لیا اور دوسری طرف خدا کی قدرت، علم اور رحمت کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذاب طویل کا سبب:

بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ جو ایک لمحہ کا کام ہے اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا ہے اسی طرح سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزارہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں حالانکہ یہ لوگ

[1] بحوالہ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۴ مصر۔

مگر ہماری ہی اوقات پر غور کرنے تو وہ ان کی تسکین کے لئے کافی ہے۔ دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے۔ چوری، قتل، خلاف قانون بات، کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کو خلاف عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بدپرہیزی اور اصول صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز تک جا کر کہیں ان چند گھڑیوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے اور کبھی اسی معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت یکساں نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گنا زیادہ ہوتی ہے کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت اور خلاق عالم کی مصلحت کی اندازہ کی جا سکتی ہے اس نے عذاب طویل سے رہائی، شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لئے یکساں نہیں ہوتی ﴿[illegible]﴾

مشرک و کافر کا آخری انجام

اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی تو کیا اہل کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم و کرم کے سزاوار ہو جائیں گے جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک و کفر کی جزا ہمیشہ عذاب اور خلود نار ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ ہے یعنی جب تک دوزخ قائم ہے اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی مگر جب حسب مشیت الٰہی وہ دن آئے کہ خود دوزخ کی مدت حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے۔

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾ [انعام۔۱۵]

فرمائے گا دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں ہمیشہ رہو گے مگر یہ کہ جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے قابل ذکر ہے "تیرا رب حکمت اور علم والا" ہے اس موقع پر خدا کے لئے خاص طور پر "رب" کا لفظ لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شان ربوبیت اگر چاہے گی اور اس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰ کی زبان سے قرآن میں یہ تصریح آئی ہے۔

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ [مائدہ۔۱۰]

بیشک جو شخص خدا کا شریک بنائے گا تو خدا نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

جزئیہ اور آیت میں ہے،

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ﴾ (اعراف۔۵)

بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانون جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو ان کے لئے کبھی دوزخ کا خاتمہ بھی ہو جائے مگر پھر بھی جنت کے ابواب میں ان کا گذر نہ ہو لیکن اس کی رحمت و مغفرت کا دائرہ اس سے بڑھ کر ہے جیسا کہ خود اس نے اہل دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ:

﴿ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴾ (ہود۔۹)

وہ سدا دوزخ میں رہیں گے لیکن تیرا رب جو چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہے کر گذرتا ہے۔

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے؟ پھر اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (اعراف۔۱۹)

اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لئے ہے۔

اس رحمت عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کو کہا جاتا ہے کہ

﴿ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴾ (انعام۔۱۸)

اے پیغمبر! اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب گنہگاروں سے لوٹایا نہیں جا سکتا۔

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں معاف کر کے جنت نصیب کرے یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کرے اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا فرمایا:

﴿ مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ﴾ (انعام۔۲)

جس سے اس دن عذاب ہٹا دیا گیا تو خدا نے اس پر رحم کیا۔

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عذاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو۔ مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے دو شعروں میں ادا کیا ہے۔

چو تهدید گیرد بخشم تیغ حکم بمانند کروبیان صم و بکم
وگر در دہد یک صلائے کرم عزازیل گوید نصیبے برم

خود اس رحمان و رحیم کا ارشاد ہے کہ جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

﴿ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَہُمَا ۫ وَ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ﴾ (۵-۱۸)

جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور آسمانوں اور زمین اور ان کے بیچ کی بادشاہی اللہ کے لئے ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

لیکن یہ اس کی مشیت جیسا کہ اس نے (البروج ۱۵) میں فرمایا ہے کہ اس کی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے وہ جو چاہے کرسکتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت و حکمت کا تقاضا ہے۔

اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدا نے تعالیٰ نے نہیں فرمائی اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے اس لئے مشرک و کافر کے انجام کے سوال کا جواب صرف مشیت الٰہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

﴿ اَلنَّارُ مَثْوٰىکُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْہَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴾ (انعام۔۱۶)

دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں سدا رہو گے لیکن جو چاہے خدا۔ بے شک تیرا پروردگار حکمت والا اور علم والا ہے۔

جمہور کا مسلک خلود نار:

جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معتقد ہے جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے اس کے نزدیک جنت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک اور کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو گنہگار تھے مگر ایمان رکھتے تھے ایسے لوگ عذاب کے بغیر یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کئے اور ایمان لائے بغیر مر گئے ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے ان کی گنہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے یہ وہ تیرہ بخت ہوں گے جس میں اس رحمت عامہ کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

رحمت عمومی کے معتقدین گذشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور ان کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں۔

۱۔ ﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَ اَعَدَّ لَہُمْ سَعِیْرًا ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْہَاۤ اَبَدًا ﴾ (احزاب۔۸)

بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے دہکتی آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

۲۔ ﴿ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْہَاۤ اَبَدًا ﴾ (جن۔۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

۳۔ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَہُمْ وَ لَا لِیَہْدِیَہُمْ طَرِیْقًا ۙ اِلَّا طَرِیْقَ

جائے گی۔

شرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی فرمایا:

۷۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ﴾ (نساء۔ ۱۸)

بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

۸۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾ (محمد۔ ۴)

بے شک جنہوں نے کفر کیا اور خدا کے راستے سے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔

ان کے لئے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے۔

۹۔ ﴿إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ﴾ (مائدہ۔ ۱۰)

یعنی جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

۱۰۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (اعراف۔ ۵)

بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔

۱۱۔ ﴿وَلَا يَحْزُنكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (آل عمران۔ ۱۸)

اور اے پیغمبر تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں غم میں نہ ڈالیں وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے خدا چاہتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں گرفتار رہے اور توبہ نہیں کی ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی اور نہ ان کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آ گئے۔

ع یا کہیں وادی بیمار پہ چلی راہ تمام

بہشت و دوزخ کی جزا اور سزا بھی تمثیلی ہے:

اوپر عالم برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمام تر تمثیلی ہوگی۔ اس تمثیل کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب و مشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ نہیں اپنے مال کا میل یعنی (حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کا میل ہے) مستحقین کو کھانے کے لئے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اس کو جان تازہ اور حیات تازگی

۹۔ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی۔ جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ۝ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ﴾ (غاشیہ۔۱)

ان کے لئے کوئی کھانا نہ ہوگا لیکن خاردار جھاڑی جو نہ موٹا کرے گی اور نہ بھوک سے بے پروا کرے گی۔

۱۰۔ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی۔

﴿وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ﴾ (حاقہ۔۲)

اور نہ کوئی کھانا مگر زخموں کا دھوون۔

۱۱۔ کھانا نگلا نہ جائے گا۔

﴿وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ﴾ (مزمل۔۱)

اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔

۱۲۔ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا۔

﴿فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِنْ نَارٍ﴾ (حج۔۲)

کافروں کے لئے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔

۱۳۔ لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے۔

﴿وَلَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ﴾ (حج۔۲)

اور ان کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔

۱۴۔ گلے میں طوق اور زنجیریں ہوں گی۔

﴿إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ﴾ (مومن۔۸)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ کھینچے جائیں گے۔

﴿إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلَ وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا﴾ (دہر۔۱)

ہم نے کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار کی ہے۔

﴿مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ﴾ (ابراہیم۔۷)

وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔

دوزخ میں روحانی سزائیں:

ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی جو اہل نظر کی نگاہوں میں ان سے بڑھ کر ہوں گی چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گذر چکا ہے دلوں کو جا کر جھانکے گی' فرمایا۔

﴿نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ﴾ (ہمزہ۔۱)

سلگائی ہوئی خدا کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی۔

﴿وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ﴾ (یونس۔۹)

اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔

﴿ يَا حَسْرَتَىٰ عَلَىٰ مَا فَرَّطْتُ فِي جَنبِ اللَّهِ ﴾ (زمر-۶)

اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔

﴿ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ ﴾ (حج-۲)

وہ جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے۔

ذلت کا عذاب:

﴿ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ ﴾ (احقاف-۲)

تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیے جاؤ گے۔

اس افسوس و حسرت و ندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

﴿ لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ﴾ (تحریم-۱)

آج معذرت نہ پیش کرو۔

نہ خدا عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو ملے گا جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائے گا

﴿ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴾ (مومنون-۶)

ذلیل ہو کر اسی دوزخ میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوے سے محروم رہیں گے۔

﴿ كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ﴾ (تطفیف)

ہرگز نہیں وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔

ان میں سے وہ جنہوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا پروردگار بھی اس دن ان کو اپنی رحمت و شفقت کی یاد سے بھلا دے گا فرمایا۔

﴿ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ﴾ (طہ-۷)

اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج تو بھی بھلا دیا جائے گا۔

بلکہ وہ دوزخی بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم سے بھی محروم رہیں گے وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور نہ ان سے کچھ بات کرے گا اور نہ ان کی اصلاح حال کی کوئی فکر کرے گا، یہ حقیقت میں شفیق و مہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق و محبت کے زخم خوردہ ہیں فرمایا۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ (آل عمران-۸)

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خرید کرتے ہیں یہ وہ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو سنوارے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

❁❁❁

جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے فرمایا:

(۱) ﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴾ [نساء-۱۲۲]

اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان میں وہ ہمیشہ کے لئے رہا کریں گے اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی؟

اس تاکید پر تاکید اور پر زور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالئے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی ابد فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا۔ اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اس پر بھی مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے؟ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی کتنی تاکید کی گئی ہے۔

۲۔ ﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ [نساء-۸]

اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۳۔ ﴿ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ (مائدہ-۱۶)

ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۴۔ ﴿ وَجَنَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ [توبہ-۳]

اور اللہ ان کو خوشخبری دیتا ہے) کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۵۔ ﴿ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ [توبہ-۱۳]

اور ان کے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۶۔ ﴿ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ [تغابن-۱]

ان کو ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۷۔ ﴿ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ﴾ [طلاق-۲]

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرے اس کو وہ ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔

۸۔ ﴿ جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ [بینہ-۱]

ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں رہنے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہا

۱۲- ﴿ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ﴾ (دخان-۳)
جنت میں جنت والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہل جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے فرمایا:

﴿ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴾ (حجر-۴)
وہاں ان کو کوئی تکلیف نہ چھوئے گی اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانۂ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے فرمایا:

﴿ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴾ (کہف-۱۲)
ہمیشہ رہیں گے اس میں وہاں سے نکل جانا نہ چاہیں گے۔

دوام و بقا اور تسلسل و عدم انقطاع کی اس قدر تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسباب مسرت کی بقاء راحت کا دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے

﴿ وَمُلْكٍ لَا يَبْلَىٰ ﴾ (طہ-۷)
اور غیر فانی سلطنت۔

کہہ کر آدم کو دلائی تھی اور جس بہانہ سے اس عالم بقا سے ان کو اس عالم فنا میں بھیجا یہ آخر وہ زمانہ آئے گا جب آدم کی اولاد کو ان کے نیک اعمال کی بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لئے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی:

دنیا میں شخصی راحت و آرام کا بلند سے بلند تخیل ایک لفظ "بادشاہی" کے اندر مخفی ہو سکتا ہے؟ اگر انسان کو اس کی اجمالی آرزوؤں کے بر آنے کی خوشخبری دینے کے لئے کوئی لفظ استعمال ہو سکتا ہے تو یہی ہے کہ بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو ناکامیابی سے محروم نہ رہے سامان راحت اور اسباب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو اونچے اونچے محل، نہر سے بھرے باغ، ٹھنڈی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زریں کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمردیں اور بلوریں پیالے، حسین و مہ جبیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازم ہیں۔

جنت کی مختصر ترین لیکن پوری تعریف آدم کے دشمن نے آدم کے سامنے کی تھی۔

﴿ وَمُلْكٍ لَا يَبْلَىٰ ﴾ (طہ-۷)
اور غیر فانی بادشاہی۔

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لئے مختلف پیغمبروں نے مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں

خدمت میں گھومتے ہوں گے اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت و عیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، ان کی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو اور ان کو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا۔ یہ تمہاری جزا ہوئی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔

یہ پورا نقشہ اس عیش و مسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے۔ اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے۔ "آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سب سے کم درجہ کون ہوگا؟ فرمایا کہ وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جا۔ وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے ہیں اور باقی جگہوں پر قابض ہو چکے ہیں۔ اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا؟ عرض کرے گا خداوندا میں راضی ہوں۔ فرمائے گا، تیرے لئے اتنا اور اس سے دوگنا اور اس سے تگنا اور چوگنا ہے۔ کہے گا خداوندا! میں راضی ہو گیا۔ خدا فرمائے گا تیرے لیے وہ اور اس کا دوگنا ہے۔ عرض کرے گا میں راضی ہو گیا۔ فرمائے گا اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔" [1]

باغ کا استعارہ:

آخرت کے خانۂ عیش و راحت کے لئے قرآن پاک نے عموماً جنت اور جنتیں، دوسرے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ عام ان کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور، بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے، اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے۔ مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے۔ اس لیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے۔ کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے؟ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے۔ انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات زمین، باغ و بہار اور کنار آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے۔ انسان کا گھر، اس کا عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے۔ اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کو اس سے پہنچی ہوتی ہیں، مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے وہ ہر غم کو فراموش اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایک شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشۂ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں۔ وحی محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے اسی لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے کہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھنچ جائے گی۔

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ سجدہ حدیث حسن صحیح۔

سامان جنت کے دنیاوی نام:

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالم آخرت کی اشیا کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے ان سے مقصود بالکل وہی چیزیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں ورنہ درحقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں۔

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ﴾ (بقرہ۔ ۳)

اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے یہ خوشخبری سنا کہ ان کے لئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ جب ان باغوں سے کوئی پھل دیئے جائیں گے تو کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا اور ان باغوں میں ان کی صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے۔

ان آیتوں کے سیاق و سباق اور نظم و ترتیب پر لحاظ کر کے صاف یہ معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کی رو سے ان الفاظ کے دنیاوی لغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے۔

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (سجدہ۔ ۲)

تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے ان کے اچھے اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

اس "آنکھوں کی ٹھنڈک" یعنی لذت و راحت کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے اس لیے یہ فرمایا گیا کہ جنت کی راحت و لذت کی حقیقت ہم و تخیل سے پوشیدہ اور مخفی ہے آنحضرت ﷺ نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرما دیا۔

﴿ قال اللّٰه اعددت لعبادي الصالحين ما لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر ﴾[1]

خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ مہیا کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔

اگر جنت کے باغوں نہروں میووں محلوں شرابوں ریشمی کپڑوں اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت

---

[1] صحیح بخاری باب کلام الرب تفسیر سورۂ سجدہ و صحیح مسلم کتاب الجنۃ و ترمذی تفسیر سجدہ۔

ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہماری دنیا میں سمجھے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جنت کی لذتوں اور مسرتوں کی ایک نئی حقیقت دکھائے گا اور خود آنحضرت ﷺ اس کی توضیح میں اس درجہ مبالغہ کرتے ہیں کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کو آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے خیال میں گزریں حتیٰ کہ ایک روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے:

﴿بله ما اطلعتم عليه﴾

جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑو۔

صحیح مسلم[1] کی روایت میں یہ الفاظ ہیں ﴿بله ما اطلعكم الله عليه﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ”بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے“ دوسرے یہ کہ ”خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے اس سے بھی درگزر کرو“ غرض ان لفظوں سے جو کچھ تم سمجھ سکتے ہو اس کو چھوڑ کر آگے چلو۔ اصحاب تفسیر نے حضرت ابن عباس سے سند نقل کیا ہے

﴿وقال سفيان الثوري عن الأعمش عن أبي ظبيان عن ابن عباس لا يشبه شيء مما في الجنة ما في الدنيا إلا في الأسماء﴾

سفیان ثوری اعمش سے وہ ابوظبیان سے وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

﴿ليس في الدنيا مما في الجنة إلا الأسماء﴾[2]

جنت میں جو کچھ ہے وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں۔

غرض ان الفاظ سے ان کی دنیاوی مشابہات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے وہ جہانِ لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں جن کی تعبیر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسبت کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مقصود ادا نہ ہو سکے اس میں الفاظ کی تنگ دامانی اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ ماجرا انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور وراء الفہم و مفاہیم کے لئے ان کی زبان و لغت میں کوئی لفظ ہی نہیں۔

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں:

یہ اصول بار بار بیان میں آ چکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں دونوں اعمال انسانی کی تمثیلیں ہیں اسی لئے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے۔

﴿إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ [طور: ١٦]

وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائے گا ”اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس ملے

1. صحیح مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا۔
2. تفسیر ابن جریر طبری آیت مذکورہ وأتوا به متشابها [illegible]

رہے ہیں تو جو تنگی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔"

مثلاً وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے تھے ان کو جنت میں امن و امان اور سلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام نعمتیں بخشی گئیں۔

﴿ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ، فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ ﴾

(طور - ۲۶-۲۷)

کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے تھے تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے بچا لیا۔

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غضب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لو کے عذاب سے بچائے جائیں گے قہر و غضب کی تمثیل شعلہ آتش لو اور گرم چیزوں سے ہے تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غضب سے ترساں تھے گویا کہ قیامت میں ان کو بادِ سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دولت مندی و قوت کی مست متکبرین، کفر اور غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر قہقہے اڑاتے تھے قیامت میں اس کا الٹا ہوگا کہ یہ ان پر ہنسیں گے فرمایا

﴿ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ .... فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴾ (تطفیف)

بے شک گنہگار ایمان والوں پر ہنستے تھے .... تو آج ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے

نیکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر جاری ہوئی۔

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت و قوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے وہ یہاں غمگین ہوں گے اور جو وہاں غمگین تھے وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے۔

﴿ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا ، وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ، إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ﴾ (انشقاق - ۱۱)

تو وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال میں (مطمئن و بے فکر) خوش تھا۔

اور غریب و مسکین جو وہاں اہل و عیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے نا آشنا تھے ان کا یہ حال ہوگا کہ

﴿ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ، وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ﴾ (انشقاق - ۱)

تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔

قرآن پاک میں بارہا جنت یعنی باغوں کی آیتیں آئی ہیں۔

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ﴾ (بقرہ - ۳)

اور ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو باغ کی خوشخبری سنا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے اس سے اس طرف خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں جن کی ترقی اور

نشوونما پانی سے ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال کی آبیاری سے ہوتی ہے، اگر ایمان ہو اور اعمال صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشوونما کی امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود و عدم یکساں ہے اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے۔

﴿ وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۔ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴾ (ابراہیم ۔ ۲۳-۲۵)

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ ان باغوں میں داخل کئے گئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے وہاں ان کی مبارکباد ہے سلام، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں ہوں اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہر وقت پھل لاتی ہے اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔

اس آیت میں جنت اور کلمہ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ "اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے" تو دوسرے میں یہ ہے کہ "وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا" کلمہ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے جس کی جڑ مضبوط اور محکم اور شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون صحابی کی وفات کے بعد کسی ایک صحابیہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان بن مظعون کی ہے انہوں نے آکر یہ خواب آنحضرت ﷺ سے بیان کیا آپ نے اس کی تعبیر میں فرمایا ذلک عملہ یجری لہ یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لیے بہہ رہی ہے (بخاری کتاب التعبیر)

ان دونوں ماقبل حوالوں سے پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہر رواں سے ہے اس بنا پر اہل جنت کے لئے باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی ان کا ایمان خوشنما اور سدا بہار باغ اور ان کا عمل صالح صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری نعمتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جا سکتی ہے علوم نبوی کے ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

﴿ واکثر الشرائع المحشرية من هذا القبيل .... و جاء الحسنات و تسمعان و تمثلان

تفسیر ابن کثیر و بخاری تفسیر آیت مذکورہ۔

[illegible] .... و تشبیہ [illegible] معنی و صورت مرئی و ملکی [illegible]
و مطلوب [illegible] و مسکن بھی ﴾ ([illegible])

حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں .... حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے .... اللہ تعالیٰ کی عنایت، مہربانی، خوش مزہ کھانے، خوشگوار پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذت نکاح، دیدہ زیب لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔

ہم نے آیات واحادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا ہے کہ اس تمثیل و تشبیہ کے کیا معنی ہیں اور کیونکر غیر مجسم معانی اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہو کر رونما ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کی دو قسمیں نکلیں گی خدا پر ایمان اور خلوص دل سے اس کی طاعت جس کو "حقوق اللہ" کہتے ہیں اور دوسری بندگان الٰہی کے ساتھ حسن سلوک، بندگان الٰہی کے ساتھ بہترین سلوک یہ ہو سکتا ہے اور وہ یہی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں مدد کی جائے اور ضروریات زندگی بھی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں۔ انہی کی نسبت ہم ان کے ساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں انہی پانچ قسموں پر منحصر ہیں۔ ایمان و اخلاص اطاعت کی جزا، خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہے وہ اپنے قرب اور دیدار سے نوازے گا عفت و عصمت کی جزا حسین اور جمیل بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوان طعام ہیں دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی نہریں ہیں۔ پہنانے کی جزا ریشم و حریر و دیبا و اطلس اور جواہر سے بہتر خوشنما لباس ہے اور رہنے اور بسنے میں حسن سلوک کی جزا خوش منظر مکان و قیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴾ (طٰہٰ: ۱۱۸-۱۱۹)

بے شک تیرے لیے اس جنت میں نہ بھوکا ہونا ہے نہ ننگا اور پیاسا ہونا نہ دھوپ میں جلنا۔

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہو گئی ہیں، جب آدمؑ اور اولاد آدم اپنے اعمال صالحہ کی بدولت نجات پائیں گے تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے نہ پیاسا ہونا ہے نہ ننگا ہونا ہے اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا۔ اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے یا تو یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کی یہ کیفیت ہوگی کہ وہاں تمام انسانی ضرورتوں سے قطعاً پاک و بے نیاز ہو جائیں گے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی اذیت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوان نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا اور پینے کے لیے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پیاسا نہ ہوگا اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جن میں دھوپ کا گزر نہ ہوگا۔

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لئے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی مسرت کو قربان

کرتا ہے اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے۔ اعمال صالحہ کے بجا لانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے۔ صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیر باد کہنا اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لئے مسجد میں جانا پڑتا ہے۔ خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے پھر انسانی زندگی کی دو چار قسمیں ہیں جن کا نام کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہے اس لئے آخرت میں ان قربانیوں کی جزاء میں انہیں کی مناسب و مماثل چیزیں ہیں جو عیش کی وہ غیر فانی زندگی اور ان طعام، اقسام شراب و شربت، انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَأَمَّا مَن طَغَىٰ ۝ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾ (نازعات-۴۰)

پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی کے ناجائز لطف و آرام کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا ٹھکانہ ہے لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔

مگر اس کی جزئی نیکیوں کی جزا بھی وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی۔

﴿وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (آل عمران-۱۸)

اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی۔

لطف و مسرت کا تصور:

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بناء پر مسرت کے وجود کے لئے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے۔ اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو تو بالآخر ان کی انتہاء انہیں باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔ اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آ سکتی ہیں، وہ یہی ہیں باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور زر و جواہر، مسرت اور راحت کا جب بھی تخیل آئے گا اور جب بھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو انہیں چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا اور ہماری انسانی فطرت انہیں مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے اور انہیں کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے اس لئے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے انہیں مادی و مانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل:

اس دنیا کے ادراک و حواس میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن عملاً اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں۔ جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی۔

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (نحل۔۳۰)

ہمیشگی کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں داخل ہوں گے، ان میں وہ سب ہے جو وہ چاہیں، اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ﴾ (حٰم سجدہ۔۴)

اور تمہارے لئے جنت میں وہ ہے جو تمہارا دل چاہے اور تمہارے لئے اس میں وہ ہے جو تم مانگو۔

﴿لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ (ق۔۳)

ان کے لئے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

﴿وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ﴾ (زخرف۔۷)

اور جنت میں وہ سب ہے جس کی دل خواہش کریں اور جن سے آنکھوں کو لذت ہو۔

﴿لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔــوْلًا﴾ (فرقان۔۲)

ان کے لئے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہیں گے ہمیشہ، یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔

﴿لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (زمر۔۴)

ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں گے۔

الغرض جنت وہ مقام ہے جہاں ہم کو وہ سب کچھ ملے گا جہاں تک ہمارا مرغوب خیال ذرا پہنچ سکتا ہے۔ لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند تخیل جو تصور میں آ سکتا ہے وہاں ہمارے لئے مہیا ہوگا۔ صحابہؓ بھی ہر قسم کے لوگ تھے جنت کے سامان مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں قائم کر، وہ کرے گا تو اللہ فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر دس گنا۔"[1] یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ وہاں کسی چیز کی کمی نہ ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی۔ (الا قطعہ ۔ من ...)[2]

---

۱ صحیح مسلم۔

۲ ترمذی ذکر سوق الجنۃ۔

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری یہ سب کام منٹوں میں[1] انجام پا جائے گا۔ ایک بدوی نے پوچھا "یا رسول اللہ وہاں گھوڑے بھی ہوں گے" فرمایا کہ "اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لئے پھرے تو وہ بھی ہوگا" دوسرے نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ! اونٹ بھی ہوگا" فرمایا "اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور جو تمہاری آنکھیں پسند کریں گی"۔[2]

جنت میں اہل جنت کے مختلف درجے ہوں گے اس لئے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دے گا (حسنی بنحمال لوجہ) کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لئے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں۔[3]

جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں:

کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے کہ

ع بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں بن سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو، یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہونے کا خوف ہے اور یا گذشتہ ناکامی کا افسوس ہے اس بنا پر یہاں کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا۔

﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اس میں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نیچے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے۔ جب تک اس کے سر کا پسینہ اس کے پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام وقتی مسرتیں ہماری فانی کوشش کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گذشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشاکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لئے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک و احتشام اور لباس و زیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد و تعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے۔

﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۔

1 صحیح بخاری۔

2 ترمذی۔

3 ترمذی کی ایک حدیث مطولہ سے لی گئی ہیں۔

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِن فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ﴾ [فاطر-۳۴،۳۵]

رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان میں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی اور وہ کہیں گے کہ پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا بے شک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔

﴿لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُم مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ﴾ [حجر-۳]

اس میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

جنت جہاں رشک وحسد نہیں:

موجودہ دنیا خیر وشر کے متضاد عناصر سے بنی ہے یہاں ثواب کے ساتھ گناہ رحم دلی کے ساتھ سنگدلی محبت کے ساتھ کینہ ہے یہ گناہ و کینہ اور بغض وحسد وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن وامان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے ہر شخص یہاں دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش وخروش سے ابلتا ہے جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا۔ ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت اور بغض وحسد کا خاتمہ ہوگا اور وہاں محبت والفت کے دریا موجزن ہوں گے، فرمایا۔

﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا﴾ [مریم-۴]

اس میں امن وسلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے۔

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ﴾ [اعراف-۵]

اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کھینچ لیا ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ [حجر-۴]

اور ہم نے ان کے سینے سے کینہ کھینچ لیا بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "وہاں لوگوں کا اختلاف ہوگا نہ باہم بغض وکینہ۔ سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے۔"[1]

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟:

بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی ان کی تعبیر الوان نعمت اور انواع شربت وشراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہو سکتی ہے مگر وہ حظ ومسرت اور اطمینان وسکون وسکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی۔ یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول وبراز، پسینہ اور سوء ہضم کی علت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ

[1] یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم صفۃ الجنۃ میں ہیں۔

وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی نہ بلغم اور کھنکار جیسی گندی چیزیں ہوں گی۔ کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو جنت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی۔ وہاں منادی غیب پکار کر کہہ دے گا یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہو گے، اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے۔ لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے کوئی ستارہ کی طرح کوئی چودھویں کے چاند کی طرح۔[1]

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی۔ اس پر تعجب نہ کرو جو ہے انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کے فضلے، اس کی سانس اور دوسرے لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات و قوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر انکار کرنا دانشمندی نہ ہوگی ویسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالم آب و گل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصول حیات، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر وہ انکار کریں تو ان کا بھی یہ فعل دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے:

مادی و جسمانی خلقت و فطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد تھا، پھر نباتات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا، اور یہ مادیت کی معراج ترقی ہے۔ جمادیت سے گزر کر نباتیت پیدا ہوئی اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے ابھی اپنے آغاز طفولیت میں ہے، کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج طے نہیں کئے جائیں گے؟ ایک مادہ پرست صرف مادی ارتقا کے نظریہ تک پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے اور یہاں سے وہ اس کو رفعت آسمان تک پہنچاتا ہے اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (مومنون: ۱۱-۱۴)

جو فردوس کی وراثت پائیں گے اور وہ اس میں سدا رہیں گے اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا، پھر اس کو ایک محفوظ جگہ میں ایک بوند بنایا، پھر اس بوند کو جما ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کھڑا کیا، تو برکت والا ہے سب سے بہتر بنانے والا خدا۔

---

[1] ایضاً

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رک نہیں جائے گی بلکہ آگے بھی ہوگی اس لئے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زیست وحیات کے محدود تصورات تھے پھر وہ نکل کر اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا جہاں ترقی و حیات کے دوسرے ہی اصول ہیں، اسی طرح اس مادی دنیا سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے چنانچہ اس کے بعد فرمایا۔

﴿ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ﴾ (مومنون-۱)

پھر بے شک اس کے بعد مرنے والے ہو، پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیتیں پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صدہا ہزارہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع فوقی کا ظہور ہوگا۔

یہاں مسئلہ ارتقاء کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو ہم اصلح کہتے ہیں کہ ان مدارج ترقی کے اثناء میں ہزاروں وہ قوتیں فنا ہوتی رہتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ کی پوری استعداد ہوتی ہے جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے اسی طرح اس دوسری فوقی نوع کی استعداد اسی کو ملتی ہے جس کے اندر اپنی پچھلی مادی و جسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی۔ دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی و نباتی و حیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دار الامتحان میں اپنی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کر سکیں۔

بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو پچھلی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا بلکہ وہ بقدر استعداد تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴾ (تین-۱)

ان بہشتیوں کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں اہل ایمان کے آگے پیچھے داہنے بائیں نور ہوگا پھر بھی دعا کریں گے۔

﴿ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (تحریم-۲)

ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑتا ہوگا اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے نور کو کامل اور ہم کو معاف کر تو ہر بات کر سکتا ہے۔

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا صاف اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے، جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشاء ہے۔

امن وسلامتی کا گھر

انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے لیکن دنیا میں امن وسلامتی کو اسباب راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈھتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا لیکن جہاں آ کر اس کو صرف امن کا گوشہ نہیں امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی۔ وہ پرندہ جو عمر بھر چاروں طرف کے قفس میں گرفتار رہا ہے اب وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا۔ جنت کے جہاں وحی محمدی نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دارالسلام بھی بتایا ہے جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر کے ہیں۔

اہل جنت کی نسبت ارشاد فرمایا۔

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (انعام-۱۵)

ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر کو مبعوث فرمایا وہ حقیقت میں اسی امن وسلامتی کی نوید بشارت ہے اسی لئے فرمایا۔

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ﴾ (یونس-۳)

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی۔ عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھے آنحضرت ﷺ کی جس صدا کو انہوں نے سب سے پہلے ان کے دربار میں سن کر گیا وہ یہ تھی "لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر اللہ کی عبادت کرو، امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔"

جنت کے ذکر میں امن وسلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (رعد-۳)

اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، تم نے صبر کیا تھا تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔

وہاں امن وسلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا۔

﴿اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ (واقعہ-۱)

لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے۔

﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ﴾ (ق-۳)

اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔

لئے روشنی ہو جائے۔

﴿ يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِن نُّورِكُمْ ﴾ (حدید-۲)

جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے اجالے سے روشنی کر لیں۔

مقام رضوان:

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقام رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا اس کے بعد کبھی وہ نہ اس بندہ پر عتاب فرمائے گا اور نہ اس سے ناراض ہوگا بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی دائمی دولت عطا فرمائے گا۔ متقیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے علاوہ دل کی مسرت رکھی ہے لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے۔

﴿ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴾ (توبہ-۳)

ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے اور ان باغوں کی جن میں نعمت ابدی قائم رہے گی۔

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے فرمایا

﴿ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۔ سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴾ (حدید-۳)

اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے جو ان کے لئے بنائی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑا مہربانی والا ہے۔

سورۂ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے فرمایا۔

﴿ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ ﴾ (آل عمران-۲)

جنہوں نے پرہیزگاری کی ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں ہیں اور اللہ کی خوشنودی۔

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوان الٰہی کو قرار دیا ہے۔

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴾ (توبہ-۹)

اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں سدا رہیں گے اور رہنے کے ستھرے گھر، اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

جنت کی مقدس روحوں کو اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی یہ مسرت سنائی جاتی ہے۔

﴿ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ﴾ (فجر۔۱)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اس طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے۔

﴿ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ﴾ (مائدہ۔۱۶)

خدا ان سے خوش ہوا وہ خدا سے خوش۔

انہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے اے ہمارے رب! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے ہاتھ میں ہیں۔ فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پا کر) اب تم خوش ہوئے؟ عرض کریں گے پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ دیا جو کسی کو نہیں دیا۔ فرمائے گا کہ میں ان تمام گزشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی (خوشی) تم پر اتاروں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ [1]

مقام طیب وطاہر

موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا:

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ﴾ (زمر۔۸)

تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی وروحانی آلائش سے بری ہوگی، فرمایا۔

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ (نحل۔۱۳)

مرد ہو یا عورت جس نے مومن ہو کر اچھے کام کئے ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک صاف اور ستھرے ہوں گے۔

﴿ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً ﴾ (صف۔۲)

اور پاک گھر۔

جو بیویاں ملیں گی وہ پاک ہوں گی۔

---

[1] صحیح بخاری ومسلم صفۃ الجنۃ۔

﴿ وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ﴾ (آل عمران-۲)

اور پاک بیویاں۔

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی۔

﴿ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ (حج-۳)

اور اہل جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی۔

﴿ شَرَابًا طَهُورًا ﴾ (دہر-۱)

پینے کی پاک چیز۔

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک و صاف، طیب و طاہر اور تمام روحانی و جسمانی آلودگیوں سے بری ہوگی۔

مقام تسبیح و تہلیل:

اس آرام و لطف کے بعد اہل جنت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل ہوگی۔ یہ ان کی روحانی غذا ہوگی وہ عالم جہاں ہر طرف انوار الٰہی برستے ہوں گے جہاں صفائی، ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہو جہاں قدوسی و نزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آتی ہوں گی وہاں حمد و ثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے۔

﴿ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ (یونس-۱)

جنت میں ان کی دعا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی اور ان کی آپس کی دعا سلامتی ہوگی اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ اللہ کی تسبیح و تہلیل کی نئی نئی پُرلطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی فرمایا۔

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ﴾ (حج-۳)

بیشک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم کی ہوگی اور وہ راہ دکھائے جائیں گے اچھی بات کی اور وہ دکھائے جائیں گے اس سراہے ہوئے (اللہ) کی راہ۔

وہ اپنے پروردگار کی نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمد الٰہی کا سرود سرمدی گائیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب عالم وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا فرمایا۔

﴿ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (قیامہ - ۱)

کتنے چہرے اس دن تر و تازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھتے ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبداللہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے" دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ویسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا"۔ اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو شدت یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک و شبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک و شبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اسی طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں مانع نہیں ہوتا اسی طرح دیدار الٰہی میں کروڑوں کا ہجوم مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن مخلوق اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی۔

﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ﴾ (احزاب - ۶)

ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے سلامتی ہوگی۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ مہربان و رحمت پروردگار خود اپنے بندوں کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا۔

﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ﴾ (یٰس - ۴)

رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا۔

بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا۔[1]

یہ روایت کئی طرح ہوئی ہے۔[2] اہل روایت الفاظ کے قائل ہیں، اہل عقل زیادت ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہل حقیقت اس کو ذات و صفات کی ناقابل بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے کہ

[illegible]

ان تعلیمات کا عملی اثر:

اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گذر چکے ہیں، ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو ان حقائق کو تسلیم کرنے سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مر کر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندگی ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھی، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے بطلان اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ ق کی تلاوت فرماتے تھے جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت سے نہ صرف انکار اقرار سے بدل گیا بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا

1. صحیح بخاری جلد ثانی ص ۱۱۰۵
2. ایضاً باب ۔۔۔

یہ مناظر ان کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے۔

یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے فخراً کہا تھا۔ [۱]

أموت ثم بعث ثم حشر	حديث خرافة يا أم عمرو
کیا مرنا ہے پھر جینا اور پھر اکٹھا ہونا	اے عمرو کی ماں یہ خرافات باتیں ہیں۔

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ فخر و انکار، یقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہتا تھا "ہم آسمان تک پہنچ گئے اور اللہ سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے ہو جائیں گے۔

﴿ وإنا لنرجو فوق ذلك مظهرا ﴾

اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔

آنحضرت ﷺ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ "جنت یا رسول اللہ!" آپ ﷺ فرماتے ہیں "ان شاء اللہ" دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جاتی تھیں ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا، جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے مواخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا، جن کو اپنے اعمال کی جواب دہی کی پروا نہ تھی، جو جزا و سزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے، جو جنت اور دوزخ کے تخیل سے نا آشنا تھے وہ اس عالم کے منظر سے ڈرنے لگے، دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آ گیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے، اعمال کی جواب دہی سے ترساں و لرزاں رہنے لگے، سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشکبار رکھتا تھا، فرائض کو بمعمولی مستعدی کی پابندی کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ رکھتا تھا، راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لئے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سراپا مصروف جدوجہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداخلاقیوں سے باز رکھتا تھا، ان کے ضمیر اور دل کے کھوٹ کو ہر وقت پروردگار کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ دو صحابیوں میں کسی جائداد کی حقیقت کے متعلق جھگڑا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں اس کا فیصلہ دے دیا پھر فرمایا "میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ چرب زبان ہو جو اپنے دعوی کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں" یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔ [۲]

حضرت عمرؓ اللہ کے مطیع و فرمانبردار تھے، دین کے پرجوش شیدا تھے، نیکیوں سے مالا مال تھے، جنت کی بشارت

---

۱ اصابہ ابن حجر ذکر نابغہ جعدی

۲ سنن ابی داؤد کتاب القضاء۔

سے سرفراز تھے تاہم آخرت کے مواخذہ اور جوابدہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ "اگر رسالت نبوی کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔ اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں مگر الٰہی! دوزخ نہ ملے" وہ نزع کی حالت میں بہت بے چین تھے بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گنا کر ان کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا "اللہ کی قسم اگر کل زمین میرے لئے سونا ہو جاتی تو اس کو دے کر عذاب الٰہی سے بچ سکتا تو میں دے دیتا" [2] ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی تھیں "اے کاش! میں جنگل کی گھاس ہوتی" "اے کاش! میں کچھ نہ ہوتی" [3]

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب موثر آیت:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُم بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ﴾ (حج۔ ۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے جس دن اس کو دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے لیکن پروردگار کا سخت عذاب ہوگا۔

جب اتری اور آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا [4] اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ [5] ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہؓ چیخیں مار مار کر رونے لگے [6] حضرت ابوہریرہؓ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اتنا کہ روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گرے اور جب امیر معاویہؓ کے سامنے یہ روایت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ [8]

اس یقین و ایمان کا دوسرا منظر یہ ہے کہ بدر کا میدان جنگ ہے مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امڈا آ رہا ہے ادھر تین سو تیرہ مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپ ﷺ صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں "لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے" ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ "کیا آسمان و زمین کے برابر؟" آپ فرماتے ہیں "ہاں" وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں۔ آپ دریافت

۱ صحیح بخاری باب الہجرۃ جلد اول صفحہ ۵۵۵۔
۲ صحیح بخاری فضائل حضرت عمرؓ جلد اول صفحہ ۵۲۱۔
۳ ابن سعد جز النساء ص ۵۱۔
۴ صحیح بخاری مناقب عائشہؓ، تفسیر سورہ نور و مستدرک حاکم تذکرہ عائشہ، ابن حنبل مسند عائشہؓ۔
۵ صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج جلد دوم ص ۶۹۲۔
۶ جامع ترمذی تفسیر سورۂ حج۔
۷ سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من عذاب القبر۔
۸ جامع ترمذی کتاب الزہد۔

اسی دفعہ دہرایا گیا کہ نئے مذہب کے ماننے والوں میں یہ عقیدہ نئے طریقہ سے پیدا کیا گیا اور یہ تعلیم محض تلقین کی صورت میں ان کی رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی اور بیان سے اس لیے کیا تاکہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے بلکہ عملی حیثیت میں اس کے پیرووں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حوادث میں تسلی و تشفی کی قوت پیدا کرے اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کرلے۔

وحی محمدی نے اس اصطلاح کے لیے دو لفظ اختیار کیے ہیں ایک "قدر" ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا "قضا" جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔

﴿ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴾ (قمر-۳)

ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔

﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَى أَجَلًا ﴾ (انعام-۱)

وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اصلی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرما دیا ہے اور متعین کر دیا ہے اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہو سکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمایا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیئے، موت و حیات، نفع و ضرر، عزت و ذلت، غرض کائنات کی ہر شئی اور ہر پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرما دیئے انہی پر وہ چل رہی ہے قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات بیان کرنے کے بعد ہے۔

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴾ (یٰس-۳)

اور سورج اپنے ٹھہراؤ کی طرف چلا جا رہا ہے یہ غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) ہے اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہیں منزلیں یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ اور زرد) ہو جاتا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا

﴿ وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا ﴾ (حم سجدہ-۲)

اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کر دیا کہ ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا۔

﴿ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ (طلاق-۱)

اللہ نے ہر چیز کیلئے ایک اندازہ ٹھہرایا ہے۔

موت و حیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے فرمایا:

﴿ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ﴾ (واقعہ۔۲)

ہم نے تمہارے درمیان موت کا اندازہ کر دیا۔

ہر شے میں اللہ نے جو اندازہ رکھا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانونِ فطرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام متعین فرما دیے ہیں جن کی اطاعت اس پر واجب ہے مثلاً انسانوں کی ترقی و زوال موت و حیات بیماری و صحت دولت و افلاس آرام و تکلیف سعادت و شقاوت ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرما دیے ہیں غرض ان کو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے۔

﴿ مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ (تغابن۔۲)

نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت لیکن اللہ کے حکم سے۔

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز باہر نہیں تھی اس لیے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے ٹلتی اور بدلتی نہیں ایسے ہی یہ باتیں اٹل تھیں اور یہ ٹلتی نہیں۔

﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴾ (فاطر۔۲)

اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جنتی ہے لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے یا اس کی عمر کم ہوتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے بے شبہ یہ اللہ پر آسان ہے۔

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا جو بچہ جنتی ہے وہ خدائے پاک کے علم سے ہے دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی عمر بھی ملتی ہے وہ کتاب الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر و غرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے اس لئے وہ کبھی اپنے کئے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت استقلال اور صبر و ثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر و مسرت اور ناکامی کے افسوس و حسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دستگیری کرے اور وہ یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے۔

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے

فضل و کرم کا نتیجہ ہے اس لیے اس پر اترانا اور فخر و غرور کرنا بے جا ہے اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس عالم الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش، ولولہ اور سرگرمی سے پھر از سر نو جدوجہد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (حدید-۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ تو خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (لوح) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے یہ اس لئے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ نے مسئلہ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کی گردنیں یقین کامیابی و فتوحات کی حالت میں خداوند قادر مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے اور ان کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند مالک کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، بیماری، بے چارگی کی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی کسی موقع پر وہ رحمت الٰہی سے مایوس نہیں ہو جاتے تھے اور بے خطر آگے کے کام کے لیے وہ قدم اٹھاتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اسی لئے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے نہ سمندر بہا سکتے تھے نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بجلی کی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے۔

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ۝ وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ (آل عمران-۱۵)

کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا ہے (انسان کے ہاتھ میں صرف اچھا یا برا ارادہ ہے اسی نیت کے مطابق کام کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اس کے اختیار میں نہیں) جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا اس میں سے دیں گے (یعنی اس کو دیں گے) اور ہم پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ دیں گے۔ کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ تو دل ہارے، نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی اور دون ہمتی نہیں بلکہ بلندی، استقلال، اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے ان کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں، کیوں کہ:

﴿ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ (توبہ-۷)

ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لئے موت لکھی ہے وہ میدان جنگ میں بھی مریں گے اور بستر راحت پر بھی اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے۔

﴿ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۔ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ﴾ (آل عمران-۱۶)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مانی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ خود اپنے مقتل میں نکل کر چلے آتے۔

﴿ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ (نساء-۱۱)

تم جہاں بھی رہو گے موت تم کو پالے گی اگرچہ تم مضبوط و مستحکم قلعوں میں ہو۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل شکست جرأت اور غیر فانی عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے۔ بعض لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ آسمانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی اور نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی، مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مصلح اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا، کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لئے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔

اب کیا محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کی تائید تھیں اور اسی طرح ایک دوسرے کی تصدیق تھیں کہ ﴿ اعملوا فکل میسر لما خلق له ﴾ (بخاری) لوگو! اپنا اپنا کام کئے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام سہل ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہی تقدیر ہے فرمایا:

﴿ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۔ وَاَمَّا

انسان کی کلی آزادی کے درمیان اور فلسفہ اخلاق والے انسان کی آزادیٔ عمل اور اس کے موروثی اثرات فطری جذبات
اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اس کو حل کر سکتے ہیں۔

دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا۔ ہر مذہب کے سامنے یہ گرہ اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں
دو ہی انہوں نے نکالی تھیں، یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور بے پاؤں اس راستے سے گزر جایا جائے یا
بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ آواگون اور کرم کی صورت میں
ہے عیسائیوں میں حضرت آدم کے گناہ اور خدا کی لے مرضی کے پیرایہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعہ تورات میں حضرت
ایوب کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے دوسری طرف مجوسی تھے جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ
خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا ۲ غرض
آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مذاہب کی یہی دو قسمیں تھیں جن کے پاس اس مشکل کی گرہ کشائی نہیں تھی یا تھی تو خدا کی
قدرت مطلقہ اور مشیت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس و مجبور نظر آتا تھا، یہ تناسخ کے چکر میں
اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گروی کر دیتے تھے، یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود
مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیاء میں آنحضرت ﷺ ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس
دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ
تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے اور آسمان و زمین، بحر و بر اور انسان و حیوان کوئی چیز نہیں، جو اس کے
ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے تحت
ہیں یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور
ایک ایسا خدا ماننا لازم آجائے جس کے اختیارات محدود، جس کی قدرت ناقص اور جس کی شہنشاہی ناتمام ہو۔

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کے برخلاف انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا
کسی نہ کسی طرح کوئی اختیار ضرور بخشا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا
جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہیں تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت
یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل
ملامت ہونا بے معنی ہو جائے کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام دینا اور برے کام پر اس کو عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے
بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

۱۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا مانگی فرمایا "اے خدا! اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے لیکن
میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو"۔ عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا بعض تفصیل محمد کرد علی کی کتاب
الاسلام والحضارۃ العربیہ جلد دوم سے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے۔

۲۔ شہرستانی ذکر ثنویہ و مقالہ اسمعیل مطبوعہ لندن۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر ارادہ کا ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر وہ ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے عمل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا اسی پر وہ فطرت کے سامنے، انسانی عدالت میں اور آخرت میں بھی سو جزا و باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لئے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا صحیفہ ربانی یعنی قرآن آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف وہ کہتا ہے کہ "خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا" اور دوسری طرف وہ کہتا ہے "ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے" یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اور کامل مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ و اختیار اور اس کے مطابق اپنے کام کرنے کے لیے اعضاء کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے یعنی ارادہ اور اعضاء کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری تکلیف باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس لئے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور بے اختیار رہا ﴿وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ اس تعلیم سے نہ تو خدا کے پاک کی قدرت واختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور قرار دیئے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا فرمایا۔

﴿فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (کہف-۴)

تو جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔

اس لئے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا ہے اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ (فصلت-۶)

جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لئے کیا تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا

کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ظلم ہوتا جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و برتر ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ سے ارشاد ہے

﴿وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ (یونس-۵)

اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے اگر چہ وہ سمجھتے نہ ہوں اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو راہ دکھاؤ گے اگر چہ وہ دیکھتے نہیں

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ (زلزال-۱)

تو جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا اس کو دیکھے گا اور جو برائی کرے گا وہ بھی دیکھے گا۔

اسی لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں:

﴿ وَالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى ﴾

اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔

کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے اچھے اور برے کام سب خدا کی طرف سے ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج، مسرت و تکلیف، دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پیش آتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ان آیتوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ "اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا" اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ خود خدا تعالیٰ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے مجبور کیے ہوئے ہے حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو خود اسلام قبول نہیں کر سکتے تھے ہاں یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دیتا ہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنانا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے۔

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (دہر-۲)

تم نہیں چاہو گے الا یہ کہ خود خدا چاہے (اور تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)

﴿ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (انعام-۱۴)

وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الا یہ کہ خدا چاہے۔

﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى ﴾ (انعام-۴)

اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔

﴿ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (انعام-۱۸)

تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو (تم لوگوں) ہدایت دے دیتا۔

﴿ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (نحل-۲)

اور اگر وہ (خدا) چاہتا البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے دے اس لیے اس مشیت الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اظہار کیا گیا ہے فرمایا۔

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (کہف-۴)

تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ (دہر-۲، مزمل-۱)

بہر حال اس مسئلہ میں بھی وحی و رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا [۱] اور در حقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے یہ کلی جہاں چٹکی کہ اس کی خوشبو اڑ گئی۔

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيْرًا ﴾ (فرقان-۱)

اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) ٹھہرایا

[۱] مشکوۃ باب الایمان بالقدر

وہ ستر شاخیں ہیں، حافظ بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ایمان کی شناخت اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے آپ نے فرمایا۔

﴿ اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا ﴾ (سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ)

مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

حسن اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اس ہستی سے ہونی چاہیے جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد اس محبت الٰہی کے محسن اور حجت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا ضروری ہے جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں، فرمایا:

﴿ لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من ولده ووالده والناس اجمعین ﴾
(مسلم و بخاری کتاب الایمان)

تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان میں کامل نہیں جب تک کہ اس کے دل میں میری محبت اس کی اولاد اور والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ اس کو اپنے ہم جنس برادری اور ہم نوعی سے بھی اسی طرح محبت پیار اور اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے، فرمایا۔

﴿ والذی نفسی بیده لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیه ولجاره ما یحب لنفسه ﴾
(بخاری و مسلم کتاب الایمان)

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک کہ وہ اپنے بھائی یا پڑوسی یا ساتھی کے لئے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا "جب تک تم مومن نہ ہو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ ہو گے جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے؟ آپس میں سلام پھیلاؤ"۔ (کتاب الایمان)

یہ محبت کسی نمائش، ریا یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو فرمایا "تین باتیں جس شخص میں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پالیا اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگان خدا سے صرف خدا کے لئے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا" ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کامل اسلام کس مسلمان کا ہے فرمایا "اس مسلمان کا جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے" فرمایا "ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک شرم و حیا ہے" یہ بھی تعلیم دی کہ "جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ زبان سے بات